باتیں کرتے دِن
امجد اسلام امجد

باتیں کرتے دِن

(شاعری)

امجد اسلام امجد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

دوستانِ عزیز

محمد عرفان صُوفی اور ایوّب خاور کے نام
حاؔلی کے اس بے مثال مصرعے کے ساتھ کہ
''دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت''

ترتیب

’’باتیں کرتے دِن‘‘ کے ساتھ کچھ لمحے

’’باتیں کرتے دِن‘‘ ترتیب کے اعتبار سے میرا پندرھواں شعری مجموعہ ہے جو میری ستر ھویں (70) سالگرہ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ یوں یہ عنوان میرے جنم دن یعنی 4راگست سے بھی ایک استعاراتی تعلق رکھتا ہے۔ پہلا مجموعہ ’’برزخ‘‘ 1974ء میں شائع ہوا تھا۔اس حساب سے یہ سرمایۂ سخن چار دہائیوں سے بھی کچھ زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے کہ ’’برزخ‘‘ میں جو کلام شامل تھا، وہ 1967ء سے 74ء تک کے سات برسوں پر محیط تھا۔اس تفصیل کا بیان اس لئے ضروری ہے کہ اس تمہید کا پسِ منظر قارئین کے ذہن میں رہے۔ یہ مکالمہ چونکہ میرے اور میری شاعری کے درمیان ہے، اس لئے آپ چاہیں تو اسے خود کلامی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ دونوں طرف سے میں ہی بات کر رہا ہوں۔ زیرِ نظر مجموعے میں شامل نظم ’’میں اور میری شاعری‘‘ کو بھی اس میں شریک سمجھا جا سکتا ہے۔

’’برزخ‘‘ سے ’’باتیں کرتے دِن‘‘ کے درمیان جو تیرہ پڑاؤ آئے، اُن کی ترتیب وار تفصیل کچھ اس طرح سے ہے: ساتواں دَر، فشار، ذرا پھر سے کہنا، اُس پار، اتنے خواب کہاں رکھوں گا، بارش کی آواز، سحر آثار، ساحلوں کی ہوا، پھر یوں ہُوا، اسباب (حمد، نعت اور سلام)، یہیں کہیں، نزدیک، شام سرائے۔ نظموں کا کلیات ’’میرے بھی ہیں کچھ خواب‘‘ اور انتخاب ’’محبت ایسا دریا

ہے''اور غزلوں کا کلیات ''ہم اُس کے ہیں''اور انتخاب ''رات سمندر میں'' بھی انہی پندرہ کتابوں کے بطن سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

میری شاعری میں غالب رنگ تو بلاشبہ ''محبت'' ہی کا ہے کہ اس بُتِ ہزار شیوہ کا ہر روپ اپنی جگہ انوکھا، نرالا اور من موہنا ہے مگر میں نے چند ایک دیگر موضوعات پر بھی تسلسل سے شاعری کی ہے، جن میں سے وقت یعنی زمان کا تصور، انصاف کے مختلف مظاہر اور حقوقِ انسانی کے فروغ اور ان کی بالادستی کے خلاف صف آرا طاقتوں کی تکذیب اور نشاندہی زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے ماضی کی زندہ اقدار، روایات اور مستقبل کی تعمیر میں مضمر سفاک اور سنگدلی پر مبنی روّیوں پر بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ ''حالاتِ حاضرہ'' سے متعلق شاعری ان پر مستزاد سمجھی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ میں نے گذشتہ چند کتابوں کے دیباچوں میں بھی کئی جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اب میرے شعر کہنے کے عمل میں کچھ عجیب سی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی اب میں پہلے کی طرح سال کے بارہ مہینے یا ہر وقت اپنی طبیعت کو شعر گوئی پر آمادہ نہیں پاتا۔ شاعری کے ہنر یعنی Craft کی بات دوسری ہے کہ بعض اوقات کسی طے شدہ موضوع پر کسی ضرورت کے تحت فوری طور پر کچھ کہنا پڑ جائے، لیکن میں اسے فنی دسترس اور منجی پیڑھی ٹھونکنے والے کام سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اصل شاعری وہی ہوتی ہے جس کی تحریک کہیں اندر سے ہو اور طبیعت اچانک خود بخود رواں ہوجائے۔ یہ صورتِ حال بیک وقت دلچسپ بھی ہے اور پریشان کُن بھی کہ نہ ''آمد'' کا یہ وفور اپنے بس میں ہے اور نہ ہی خشک سالی کے وقفوں سے نکلنے کا کوئی راستہ سمجھ میں آتا ہے۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ گذشتہ تین برس کے دوران رونما ہونیوالے چار تخلیقی ادوار پر مبنی اور مشتمل ہے۔ میں نے ان سے بھرپور فائدہ تو ضرور اُٹھایا ہے لیکن ایمانداری کی بات یہی ہے کہ ان کی آمد و رفت کی حد تک ''نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم''۔ بس خود بخود ایک رَو سی آتی ہے جو چار سے آٹھ نو دن تک چلتی ہے اور پھر ایک دم یوں محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے یک دم آدھی رات کو بجلی چلی جائے اور کوئی موم بتی تک دستیاب نہ ہو۔

بعض اوقات یہ خشک سالی کے وقفے اس قدر طویل اور مایوس کن (Depressing) ہو جاتے ہیں کہ اپنی ہی شاعری پڑھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ ایں ہمہ آوردۂ من۔ چند برس پہلے

تک اس طرح کی صورتِ حال میں گھبراہٹ بہت زیادہ ہوتی تھی لیکن اب میں کسی حد تک اس سے سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ کم وبیش یہی صورتِ حال شعری مضامین اور موضوعات کے حوالے سے بھی ہے کہ بعض اوقات ایک ہی موضوع روپ بدل بدل کر سامنے آتا رہتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُسی موضوع کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک تک نظر نہیں آتی۔ اس کتاب میں بھی آپ کو اسی نوع کی بوقلمونی دکھائی دے گی کہ کچھ قدرے مختلف موضوعات پر بہت سا کلام ملے گا اور کچھ محبوب اور آزمودہ مضامین خال خال دکھائی دیں گے۔

اس کتاب میں طویل نظم تو شائد صرف ایک ہی ہے (جہاں ہم ہیں) مگر آپ کو دس سے زیادہ اشعار پر مشتمل غزلیں معمول سے بہت زیادہ ملیں گی۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کی بھی کوئی معقول اور قابلِ ذکر وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ اِسی طرح Nostalgia، فلسفے اور پچھتاوے کے عناصر زیادہ اور اُس ہمہ جہت معاشرتی زوال کا تذکرہ نسبتاً کم ہے، جس کا ذکر میں اکثر کرتا رہتا ہوں۔ اسی طرح سیاسی انتشار، بے سمتی اور اس کے محرکات پر کئی ایسی نظمیں اور اشعار ہیں جن میں میرا لہجہ زیادہ تلخ اور براہِ راست ہوگیا ہے۔ اس آخری بات کی وضاحت کے لئے پیرو مرشد مرزا غالبؔ کا ایک شعر شائد کام دے جائے۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سِوا ہوتا ہے

محبت کی نظمیں ہیں تو بہت کافی لیکن ان میں اب وہ رنگ اور مزاج شائد نظر نہ آئے جو ابتدائی اور درمیانی دور کی شاعری میں غالب تھا۔ میرے خیال میں یہ ایک فطری عمل ہے کہ اب کالج کی سیڑھیوں سے اُترتی ہوئی وہ لڑکی جسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے دل میں اُتر رہی ہو اب صرف ایک یاد ہے امرِ واقعہ نہیں۔

اس کتاب میں ایک نظم میری شریکِ حیات (فردوس کے لئے ایک نظم) کے نام سے ہے۔ چار دہائیوں پر پھیلی ہوئی یہ رفاقت کی خوشبوئیں تو میری تمام شاعری میں شروع سے ظہور کرتی چلی آ رہی ہے کہ میری پہلی کتاب ''برزخ'' کا انتساب بھی فردوس ہی کے نام تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں جی چاہا کہ گوروں کے سیکنڈ ہنی مون کی طرح اس احساس اور تاثر کو پھر سے جیا جائے۔ میری ایک

مقبول نظم ''تمہیں مجھ سے محبت ہے'' بھی اسی ''تائیدِ تازہ'' کے دل کشا احساس کی دین ہے۔ جس کی ابتدائی تین لائنیں درج کر کے میں اس کتاب کی حد تک آپ سے اجازت لیتا ہوں۔

محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے
کہ یہ جتنی پرانی، جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اسے تائیدِ تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے۔

امجد اسلام امجد

حمد

ہے جو بے کنار یہ دائرہ، مِرے چار سُو، اللہ ہُو
اِسی دائرے کے گمان تک، مری جستجو، اللہ ہُو

مرے راستوں میں قدم قدم اُسی بے نشاں کے نشان ہیں
وہی عکس ہے سرِ آئنہ، مرے رُو برو، اللہ ہُو

مِرا بخت کیا، مرا رخت کیا، مری نیستی، مرا ہست کیا
مِرے چارہ گر، ترے ہاتھ ہے مری آبرو، اللہ ہُو

تری راہ میں، تری چاہ میں، کٹے عمر تیری پناہ میں
مرے ساتھ ساتھ ہے رات دن، یہی آرزو، اللہ ہُو

وہ جو سر تنے تھے غرور سے، جو دکھائی دیتے تھے دُور سے
نہ وہ تخت باقی رہے کہیں، نہ وہ کاخ و کُو، اللہ ہُو

ہے زماں مکاں میں جو گونج سی ترے اسمِ معجزہ ساز کی
یہی وِرد جاری رہے سدا، اللہ ہُو اللہ ہُو

کوئی اجنبی سی مہک سی ہے، کوئی آشنا سی کسک سی ہے
مری روح جس کی تلاش میں پھِرے کُو بہ کُو، اللہ ہُو

وہ جو کُن کے حرف کا راز ہے، کُھلے کیسے مولا کہ اُس گھڑی
نہ زمان تھا، نہ مکان تھا، نہ کوئی نمو! اللہ ہُو

ایک حمدیہ نظم

کوئی تو ہے جو دِنوں کی شکلیں بدل بدل کر
انہیں گھماتا ہے اور ہر دم پھرا رہا ہے
کہ جن سے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں سب مقدّر!

کوئی تو ہے جو دِلوں میں ایسے لطیف جذبے اُبھارتا ہے
کہ جن کی آہٹ سے بھر سے جاتے ہیں
روز و شب کے یہ کَف اُڑاتے ہوئے سمندر!

ہمارے اندر کی اور باہر کی کائناتیں
ہر ایک ذرہ ہے جن کا اپنی جگہ مکمل
اک ایسی دنیا جو ضابطے سے بنی ہوئی ہے
نظام جس کا، ہر ایک ساعت یہ کہہ رہا ہے

’’اِسے کسی نے بڑی توجّہ سے اور اپنی گماں سے بالا
عظیم قدرت سے وا کیا ہے‘‘
اگر یہ سچ مچ کسی طرح کا اک ارتقاء ہے
تو پھر بھی اس کو ہم ’’اتفاقاً‘‘ نہ کہہ سکیں گے
کہ ایسی ترتیب اور تراوش، حدِ تخیّل سے ماورا ہے
یہ حادثہ جس کو کہہ رہے ہیں
بغور دیکھیں تو ’’واقعہ‘‘ ہے‘‘
ہر ایک ذرّہ یہ کہہ رہا ہے

’’وہی تو ہے جو دِنوں کی شکلیں بدل بدل کر
انہیں گھماتا ہے اور ہر دم پھِرا رہا ہے
کہ جن سے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں سب مقدّر
وہی تو ہے جو دِلوں میں ایسے لطیف جذبے اُبھارتا ہے
کہ جن کی آہٹ سے بھِر سے جاتے ہیں
روز و شب کے یہ کَف اُڑاتے ہوئے سمندر!

نعت

جب جب رسولِ پاکؐ کے مہمان ہم ہوئے
کیا کیا نہ اپنے بخت پہ حیران ہم ہوئے

آئے تھے اس جہان میں ہم آدمی مثال
اُنؐ کی نظر کے فیض سے انسان ہم ہوئے

ترتیب میں گو آخری اُمت ہے آپؐ کی
لیکن کتابِ زیست کا عنوان ہم ہوئے

منظور تھی حضورؐ کی سنّت کی پیروی
جب بھی کسی کے درد کا درمان ہم ہوئے

ہوتا ہو جس میں تذکرہ اُس شہرِ علمؑ کا
اُس انجمن میں جان کے نادان ہم ہوئے

کھولیں کچھ ایسے آپؐ نے گرہیں حیات کی
مبہم سا ایک راز تھے، آسان ہم ہوئے

قابو کیا جو اُنؑ کی ہدایت پہ نفس کو
کل کے فقیر، آج کے سلطان ہم ہوئے

ہر طرح کی غلامی سے پائی نجات، جب
صَلِّ علیٰ کے تابعِ فرمان ہم ہوئے

اُسوہ ہے اُنؐ کا روشنی اور راستی کا گھر
ہم پر یہ لُطفِ خاص کہ دربان ہم ہوئے

ایسا دِیا ہے آپ نے انصاف کا سبق
ہر مسئلے میں آخری میزان ہم ہوئے

اُن کے کرم سے علم کی دولت ہوئی عطا
حق کی صدا، شعور کی بُرہان ہم ہوئے

ہے ربِّ کائنات کی رحمت قدم قدم
یہ کس سخی کے شہر میں مہمان ہم ہوئے

نعت

اے کہ ترا وجود ہے رونقِ بزمِ کائنات
تیرے لئے بنی زمیں، تیرے لئے یہ شش جہات

تیرے طفیل دُکھ بھری آنکھوں کو حوصلہ ملا
تجھ سے ہُوا ہے خلق کا، مالکِ کُل سے ارتباط

سیکھا ہے تجھ سے نفس نے کرنا گناہ سے گریز
تجھ سے مری گرفت میں آیا جہانِ ممکنات

تجھ سے بَھرا دُرود کے، وِرد سے، آستانِ جاں
رُوح کو جگمگا گیا تیری نظر کا التفات

تیرے بیانِ خیر کے، ذکرِ جمیل کے، سوا
کارِ دِگر ہے بے ثبات، بارِ دِگر ہے بے ثبات

جتنا بھی ہو سکے ڈرو، جتنی بھی ہو سکے کرو
لفظوں کے انتخاب کی، مدحِ نبیؐ میں احتیاط

بُجھتے ہوئے دلوں میں جب اُس نے جلائیں مشعلیں
سوچ میں پڑ گئی تھی موت، دیکھتی رہ گئی حیات

حق کو گواہ کر کے ہی دِین کی اُسؐ نے بات کی
کُفر کے دیپ بجھ گئے، شرک سے مل گئی نجات

امجدؔ رسولِ پاکؐ کی سُنّت ہے ایسا راستہ
جس کے محیط میں عیاں، رازِ و جوازِ کائنات

شبِ معراج

اُس ایک لمحے میں کیسے سمٹ گئے، اُس رات
وہ بے کنار زمانے، وہ روشنی کے سال
کسی کو جن کا سفر راستہ، نہیں معلوم
وہ شہسوار کہ بُرّاق جس کا توسن تھا
کہاں کہاں سے گذر کر گیا، نہیں معلوم!

رُکا ہوا تھا کہ بہتا رہا تھا وہ دریا؟
(ازل ابد کے کناروں سے بھی ہے جو باہر)
جسے ہم اپنی سہولت کے واسطے یوں تو
حصارِ گردشِ دورِ زمان کہتے ہیں
پَر اس پہیلی کا ہم کو سِرا نہیں معلوم!

اُسی سفر کی نشانی ہے یہ شبِ معراج
کہ جس کا پہلا پڑاؤ تھا بیتِ مقدس میں
کہاں پہ جا کے ہُوا دوسرا، نہیں معلوم!

تمام اگلے زمانوں کے واسطے یہ سفر
ہے ایک زندہ حقیقت بھی، استعارا بھی
پلٹ کے آئے تھے جب آپؐ، گرم تھا بستر
ہے اہلِ دل کے لیے اس میں اک اشارا بھی
(نہیں ہے وقت، تصوّر سے ماورا، تو پھر
سوال یہ ہے کہ اس بے کنارِ ہستی میں
گزر گیا ہے جو لمحہ وہ کیا گزارا بھی!)

طلسمِ وقت کی تمثال ہے شبِ معراج
کہ ماورائے مہ و سال ہے شبِ معراج
گمان و عقل کے ہر وار کے مقابل میں
خدا کی بخشی ہوئی ڈھال ہے شبِ معراج
زمیں سے ملنے لگی تھی فلک کی حد جس دم
اُس ایک لمحے کا احوال ہے شبِ معراج

فِردوس کے لیے ایک نظم

وہ میری ہم سفر بھی ہے لہجہ شناس بھی
خوشبو مثال ہے جو مرے آس پاس بھی

جس سے ہو آشکار مرے دل کی کیفیت
الفاظ کی گرفت میں آتی نہیں وہ بات

یُوں ہیں بیانِ شوق کی راہوں کے پیچ و خم
بے نام کہکشاؤں میں اُلجھی ہو جیسے رات

دھڑکن میں اعتماد تو ہاتھوں میں ہاتھ ہے
ہر دُکھ میں ہر خوشی میں مرے ساتھ ساتھ ہے

آئی وہ میری زیست میں اک خواب کی طرح
حاصل ہو جو کتاب کا اُس باب کی طرح

وہ میری ہم سفر بھی ہے لہجہ شناس بھی
خوشبو مثال ہے جو مرے آس پاس بھی

2012ء کی آخری رات

کیا عجب رات ہے یہ
اپنے آئندہ ورفتہ کے خم و پیچ میں گُم
سال کی آخری شب

سال کی آخری شب
جس کے ماتھے پہ لکھا رکھا ہے
جا چکے سال کے پُل پَل کا حساب
بختِ خوابیدہ کی ہمراہی میں
جاگتی آنکھ کے خواب!
کورے کاغذ کی طرح جس کی سَحر

اب نئے سال کے ایوان میں حاضر ہوگی
لے کے ایک اور کتاب!

سال کی آخری شب، جس کے قدموں کے تلے
ڈھیر سا ایک لگا جاتا ہے
اُن تمنّا سے بھرے خوابوں کا
کوئی تعبیر نہ مل پائی جنہیں
نہ کوئی راہ، نہ منزل، نہ کسی بھید کا حل
اور تا حدِّ نظر
جس کی آنکھوں میں کِھلے اور مِٹے جاتے ہیں
لمحہ لمحہ نئی اُمید کے، آنسوں کے کنول
بِھیڑ اتنی ہے ستاروں کی فلک پر، کوئی
ہر قدم، کان میں کہتا ہے، ذرا دیکھ کے چل

رات کے وسط میں ٹھہرے ہوئے اس پَل کے اِدھر
ہر طرف شور ہے اور گونجتے آوازے ہیں
اور اُس پار وہاں
اجنبی شہر ہے کوئی، جس میں
نیم وا کھڑکیاں، رازوں بھرے دروازے ہیں۔

اس زمیں پر ہیں کئی شہر کے جن میں اب تک
اِک نئے دن میں بکھرتی ہوئی اس رات کا جسم

ہے ابھی ''پچھلے'' برس میں زندہ
اور وہ دوست، کہ جو دُور بہت دُور کہیں
اجنبی دیسوں کے بے مہر در و بام کے بیچ
مجھ سے اک سال پَرے بیٹھے ہیں
کون بتلائے انہیں!
وہ اُسی طرح، ہیں اب تک موجود
مِرے دل میں، مِری یادوں میں، مِرے خوابوں میں
میں اگر یاد ہوں اب تک اُن کو!
تو انہیں میری قسم، میری محبت کی قسم
ایک لمحے کو سہی، پھر سے مجھے یاد کریں
اُس برس میں جو ابھی اُن کے لئے زندہ ہے
اور یہاں بیت گیا، جا بھی چکا۔

کیا عجب رات ہے یہ
جس کے آئندہ و رفتہ کے خم و پیچ میں گُم
ایسے منظر ہیں جہاں ایک ہی رنگ کو ہم
کبھی غنچے تو کبھی گُل کی طرح دیکھتے ہیں
ایسے لمحے ہیں جنہیں
کبھی دریا تو کبھی پَل کی طرح دیکھتے ہیں۔

غزل

وہ دِن گئے کہ دیکھتے عِزّت ہے کس کے پاس
اب مسئلہ ہے صرف کہ طاقت ہے کس کے پاس

گرتے ہوؤں کو تھام لے، رستہ کسی کو دے
عُجلت زدوں کی بِھیڑ میں فرصت ہے کس کے پاس

بس اس پہ ہو گا فیصلہ، افراد ہوں کہ قوم
رزقِ شعور، علم کی دولت ہے کس کے پاس

صدیوں سے اپنی آنکھ میں ٹھہرے ہیں کچھ اصول
کُھلتا نہیں نفاذ کی قوّت ہے کس کے پاس!

آنکھیں تو سب کے پاس ہیں پر دیکھنا ہے یہ
ان منظروں میں ڈولتی حیرت ہے کس کے پاس

یہ عرصۂ حیات تو قدموں کی دُھول ہے
جس کو نہ ہو زوال وہ شہرت ہے کس کے پاس!

معلوم ہی نہیں کہ ہے آقاؐ کا دَر کہاں
سر کو جھکائے بیٹھی یہ اُمّت ہے کس کے پاس!

کس کے سفر میں ماں کی دعائیں ہیں ساتھ ساتھ
روزِ جزا سے قبل یہ جنّت ہے کس کے پاس

دیکھو تو اِن کے مال کا ممکن نہیں شمار
لیکن سکونِ قلب کی راحت ہے کس کے پاس

لیتے ہو تم جو قیس کا اور کوہ کن کا نام
اُن کے جنوں کی کاذبو، شدّت ہے کس کے پاس

دنیا کی بے وفائی پہ حیرت ہے کس لئے
رہتی تمام عمر یہ عورت ہے کس کے پاس؟

اچھی بہت ہیں آنکھیں تری اے غزالِ جاں
ایسی کشش کہاں ہے! یہ وحشت ہے کس کے پاس؟

منظر کے پار ہوتے ہیں منظر کچھ اور بھی
جو اِن کو دیکھ لے وہ بصیرت ہے کس کے پاس

امجدؔ کسی کے سامنے کیجیے نہ عرضِ حال
اس رہ گزر میں اتنی فراغت ہے کس کے پاس!

غزل

پرندوں کی طرح اُڑتے، اگر موسم ملا ہوتا
اُٹھا کر سر، یہاں چلتے اگر موسم ملا ہوتا

ہر اِک منظر بدل جاتا پسِ منظر بدل جاتا
اگر تُم مل گئے ہوتے، اگر موسم ملا ہوتا

ہمارا ساتھ جب چُھوٹا خزاں کے آخری دن تھے
یہ غنچے کِھل گئے ہوتے، اگر موسم ملا ہوتا

تمہاری بات سننے تو رُتیں خود چل کے آتی ہیں
ہم اپنی بات بھی کہتے، اگر موسم ملا ہوتا

یہی کردار بھی ہوتے، کہانی بھی یہی ہوتی
مگر قصّے بدل جاتے، اگر موسم ملا ہوتا

گزرنے ہی نہ ہم دیتے کوئی لمحہ رفاقت کا
سَمے کو روک سکتے تھے، اگر موسم ملا ہوتا

انہی بے سَمت رستوں میں انہی سنگین راہوں پر
تمہارے ساتھ ہم چلتے، اگر موسم ملا ہوتا

تمناؤں کے جو غنچے اُٹھاتے ہی نہیں سر کو
یہ بچّوں کی طرح ہنستے، اگر موسم ملا ہوتا

ستارے مل بھی سکتے تھے یہ غنچے کِھل بھی سکتے تھے
اگر کچھ دیر تم رُکتے، اگر موسم ملا ہوتا

بہت ممکن ہے بن جاتے پیمبر صبحِ فردا کے
یہ سارے پھول سے بچے، اگر موسم ملا ہوتا

یہ نقشِ پا سے جو امجدؔ مِٹے جاتے ہیں صحرا میں
یہ بن جاتے نئے رستے، اگر موسم ملا ہوتا

محبت کے دو رُوپ

محبت کی کوئی بھی طے شدہ صورت، کوئی سانچہ نہیں ہوتا
یہ جس بھی دل میں پیدا ہو
اُسی کے ظرف میں ڈھل کر کوئی پیکر بناتی ہے
کہیں گہرائی ہے اس میں
کہیں رفعت، کہیں وسعت
اسے جس سمت سے دیکھو
یہ ہر اِک زاویئے سے اک نیا منظر بناتی ہے

مگر یہ ایسا تحفہ ہے کہ جو قسمت سے ملتا ہے
کئی دل ہیں کہ جن کو دیکھ کر
یہ دُور سے رستہ بدل جائے
انہیں چھُو کر گزرنا بھی اسے اچھا نہیں لگتا

کہ یہ جذبوں کی بھی اشیا نمط قیمت لگاتے ہیں
انہیں اغراض کی میزان پر تولے بِنا
رستہ نہیں دیتے
اور ان کے بانجھ سینوں میں
ہوس کی آگ کے شعلے
کبھی مدّھم نہیں ہوتے

محبت اور اِس سے ملتے جلتے سارے جذبوں کو
یہ پتھر سے تراشے دل ٹشو پیپر سمجھتے ہیں
ٹشو پیپر
کہ جن کی آخری منزل وہ کُوڑے دان ہوتی ہے
جہاں ہر شئے کسی لا، شے کی صورت، شکل سے محروم ہو جائے
جہاں ہلچل نہیں مچتی، جہاں موسم نہیں ہوتے

ذرا سوچو
تو ایسے دل بھی کُوڑے دان سے کچھ کم نہیں ہوتے!

غزل

اپنے کمالِ فن کی خبر خاک سے ملی
کوزہ گروں کو دادِ ہنر چاک سے ملی

اہلِ نظر کے واسطے ذِلّت سے کم نہیں
عزت، جو صرف زینتِ پوشاک سے ملی

ہم پر ہمارے ہونے کا کھولا ہے جس نے راز
وہ بات ایک صاحبِ ادراک سے ملی

اُس کم سخن نے اور بھی مشکل کیا اُسے
اُلجھن جو اُس کے گیسوئے پیچاک سے ملی

لوٹے گھروں کو جب وہ پرندے تو ہر خبر
اُن کو ہوا کے گریۂ نمناک سے ملی

عزت ملے، ملے نہ ملے، کس کو فکر ہے
شہرت تو خوب لہجۂ بے باک سے ملی

دیکھو تو دن کے بھیس میں چُھپتی ہوئی ضیاء
اہلِ نظر کو رات کے ادراک سے ملی

کیا ظلم ہے کہ شہر کے لوگوں کو روشنی
امجد خود اپنے سینۂ صد چاک سے ملی

غزل

جو سامنے تھا کیوں وہ خزانہ نہ مل سکا!
سوچا بہت پہ کوئی بہانہ نہ مل سکا

زادِ سفر کو جو بھی تھا درکار، سب ملا
تھی جس کی جستجو وہ زمانہ نہ مل سکا

چھانیں تہیں زمین کی، دیکھا سب آسماں
لیکن کہیں وہ دوست پرانا نہ مل سکا

سب سے الگ تھی اُن کی تڑپ، شام کے سمے
جن طائروں کو اپنا ٹھکانہ نہ مل سکا

پوچھا کسی نے اس طرح ہم سے ہمارا حال
اشکوں کو روکنے کا بہانہ نہ مل سکا

ہر ہر قدم پہ یوں تو ملے کتنے غمگسار
سر جس پہ رکھ سکیں وہی شانہ نہ مل سکا

ڈولے پِھرے ہواؤں میں امجدؔ تمام عمر
ہم ہیں وہ تیر جن کو نشانہ نہ مل سکا

زندگی اے زندگی

زندگی اے زندگی
تری طلب میں جو گئے، فنا کا رزق ہو گئے
کسی کی تُو نہ ہو سکی
زندگی اے زندگی

ترے سفر پہ جو چلا وہ مُڑ کے دیکھتا نہیں
ترا تو ہو نہیں سکا اپنا بھی وہ رہا نہیں
یہ کس طرح کی پریت ہے یہ کس طرح کا پیار ہے
نہ جیت اپنی جیت ہے نہ ہار اپنی ہار ہے

یہ آ گئے ہیں ہم کہاں
کدھر ہے یار کی گلی!
زندگی اے زندگی!

دھواں دھواں ہے چاندنی بجھے بجھے ہیں آئنے
گماں ہی گماں ہے جو ہے نظر کے سامنے
کدھر سے آ گئی خزاں
بہار کس طرف گئی!
کہاں گئیں وہ محفلیں
وہ روشنی کدھر گئی!
زندگی اے زندگی
زندگی اے زندگی!

تبدیلی

بدلے گا جب نظام تو پھر اس کے ساتھ ساتھ
بدلے گا یہ سماج
پھیلے گی اپنے چار سُو خوابوں کی روشنی
بدلیں گے سب رواج
گاؤں کے رنگ ڈھنگ بھی اور شہر کا مزاج

بدلے گا اپنی سوچ کا محور کچھ اس طرح
بستی میں لوٹ آئے گا موسم بہار کا
اپنی زمیں پہ اپنے ہی لوگوں کا ہو گا راج

اک دائرے کے بیچ جو چلتے تھے رات دن
اُن کو ملے گا اک نیا مرکز کہ جس میں ہو
آزاد اُن کی زندگی، محفوظ ان کی لاج

بدلے گا جب نظام تو پھر اس کے ساتھ ساتھ
بدلے گا یہ سماج

غزل

محبت میں کسی کا بھی خسارا ہو نہیں سکتا
ہمارا ہو نہیں سکتا، تمہارا ہو نہیں سکتا

کسی کا حق ہو لیکن اُس کو کوئی اور لے جائے
کسی صاحب نظر کو یہ گوارا ہو نہیں سکتا

وفا کی پاسداری میں نہیں چھوٹا بڑا کوئی
یہ ایسی جنس ہے جس کا اجارا ہو نہیں سکتا

نہ چھوڑے گی یہ دامن کو اگر دنیا کو چھوڑیں بھی
یہ ایسا شر ہے کہ جس کے بِن گزارا ہو نہیں سکتا

کہ جو خود اپنی گردش کے بدلنے پر نہیں قادر
مِری قسمت کا مالک وہ ستارا ہو نہیں سکتا

گزر جاتا ہے جو منظر وہ پھر واپس نہیں آتا
کہ کوئی جا چکا لمحہ دوبارا ہو نہیں سکتا

بہت ہے ڈُوبتے کو یوں تو تنکے کا سہارا بھی
مگر دیکھو تو یہ کوئی سہارا ہو نہیں سکتا

بظاہر دیکھنے میں لاکھ ہی پلڑے برابر ہوں
اگر میزان جھوٹی ہو نتارا ہو نہیں سکتا

نہ ہے وہ شور لہروں کا، نہ منزل کی کشاکش ہے
کہ دریا کی طرح ہرگز کنارا ہو نہیں سکتا

جتاتا ہے ہمیں امجدؔ جو وہ سختی مسافت کی
تو کیا یہ رُخ بدلنے کا اشارا ہو نہیں سکتا!

غزل

جب پرندے کسی پرواز سے تھک جاتے ہیں
اِن میں یادوں کے نئے پَر سے نکل آتے ہیں

یہ رواں ریگ کا صحرا نہیں کٹتا ہم سے
اپنے ہی نقشِ قدم لوٹ کے آ جاتے ہیں

ایک شب درد کے ماروں میں گزاریں تو سہی
آپ تو آس بندھاتے ہیں، چلے جاتے ہیں

عشق والوں کا پرندوں سے ہے رشتہ کوئی
ایک ہی نام کو دن رات جو دہراتے ہیں

اپنی مرضی سے اصولوں کو بدلنے والے
جیت جانے پہ بھی تعظیم کہاں پاتے ہیں!

کون سے جُرم کا احساس انہیں ڈستا ہے
اپنا سایا بھی نظر آئے تو گھبراتے ہیں

آئنہ دیکھنے والوں کے تکبّر پہ نہ جا
صد غنیمت ہیں یہ کچھ لوگ جو شرماتے ہیں

چاند کے گرد جو ہالہ ہے اسے غور سے دیکھ
اچھی صحبت سے یونہی لوگ سنور جاتے ہیں

وہ ایک بات

دَس میں سے کوئی ایک بھی نمبر ہو گر غلط
ملتا نہیں وہ شخص جسے فون کیجئے
ملتے ہیں راہِ زیست میں جتنے بھی ہم سفر
اُن سے تعلقات کی نازک سی ڈور کا
ایسا ہی کچھ ہے حال
چُبھ جائے ان کے دل کو اگر ایک بات بھی
اُس سے بنائے جاتے ہیں اُلجھا سا ایک جال

ایسا ہی ایک جال ہے اب اپنے بیچ میں
جس نے ہماری راہ کو کانٹوں سے بھر دیا
مدّت سے اُس کے فون میں محفوظ تھا جو نام
اُس نے بس ایک آن میں ڈیلیٹ(1) کر دیا

Delete (1)

ایسے میں کوئی کیا کرے!

چُپ چاپ اگر کوئی آنکھوں میں ٹھہر جائے
دھڑکن میں سنائی دے سانسوں میں اُتر جائے
اے دوست بتا تُو ہی، ہم روک سکیں کیسے
جب آنکھ جھپکنے میں
اک تیر چلے ایسا جو رُوح کی گلیوں میں
بجلی کی طرح کوندے اور سَن سے گزر جائے!

غزل

اپنی مٹّی رَولتے ہم اور کیا
آنسوؤں سے بولتے ہم اور کیا

کوئی سنتا ہی نہیں تھا، شہر میں
بھید اپنے کھولتے، ہم اور کیا

یہ جواہر تھے بہت ہی قیمتی
کنکروں سے تولتے ہم اور کیا

تنگ ہوتے جال میں تقدیر کے
بے ارادہ ڈولتے ہم اور کیا

ایک گن رس بھی نہیں آیا نظر
رَس ہوا میں گھولتے ہم اور کیا

کہہ رہی تھی حال امجدؔ خامشی
تم بتاؤ، بولتے ہم اور کیا

میں اور میری شاعری

سوچا بہت پہ راز یہ اب تک نہ کُھل سکا
کیسا عجب ہے شعر کی آمد کا سلسلہ
ہوتی ہیں جیسے زور سے موسم کی بارشیں
آتے چلے ہی جاتے ہیں یوں غیب سے خیال
لگتا ہے جیسے ڈوب ہی جائے گی یہ زمیں
جیسے کسی کا لکھّا ہوا پڑھ رہا ہوں میں
لہجے بدل بدل کے، نئے زاویوں کے ساتھ
کوئی دِکھا رہا ہے یہ منظر نئے نئے
لگتا چلا ہی جاتا ہے پُھولوں کا ڈھیر سا
رستے میں جیسے سیل کے، جمتے نہیں قدم
بہتا چلا ہی جاؤں ہُوں موجِ خیال میں
عامل کے سامنے کسی معمول کی طرح

پھر جیسے پھیل جاتی ہے سارے میں تیز دھوپ
اُڑتی ہے بھاپ بن کے گئی بارشوں کی یاد
خود ہی لکھے تھے لفظ جو، لگتے ہیں اجنبی
یوں دیکھتے ہیں جیسے ہمیں جانتے نہیں
سوچیں ہزار، پھر نہیں آتے یہ ہاتھ میں
کتنا لگائیں زور مگر سُوجھتا نہیں
کیسے انہی کے ساتھ ابھی کھیلتے تھے ہم!

پڑتا ہے دشتِ ذہن میں کچھ اس طرح کا قحط
سعدیؔ نے بھی جو قحط نہ دیکھا دمشق میں
اس سیلِ بے پناہ کے ورثے کی ایک بوند
عنقا کی مثل دیکھو تو آتی نہیں نظر
ایسا عظیم خوف ہے یہ بانجھ پن کا ڈر
جس کی نہیں مثال کسی بھی زبان میں

ان دونوں کیفیات کے بھیدوں سے آشنا
جتنے ہیں لوگ ان میں ہے میرا شمار بھی
اس ماہ رُو کی، شعر کی دیوی کہیں، جسے
صحبت بھی میں نے دیکھی ہے اور انتظار بھی
اُس ایک ہی نگار کے دونوں یہ رُوپ ہیں
صحرا میں اُڑتی ریت بھی اور آبشار بھی

ان موسموں کے پھیر میں قائم رہے سدا
میرے ہنر کا نقش، مرا اعتبار بھی
امجد سخن کے باب میں اتنی ہے بس دُعا
خلقت بھی مجھ سے خوش رہے پروردگار بھی

جہاں ہم ہیں

جہاں، ہم ہیں
وہاں پر دِن بھی چہرہ ڈھانپ کر ایسے نکلتا ہے
کہ جیسے گھات میں اُس کی لگے ہوں، شہر کی سڑکوں
کے اِرد گرد بکھرے پیڑ، کھمبے اور مکاں سارے
جدھر جائے، ہوا جاسوس کی صُورت تعاقب اُس کا کرتی ہے
یہ اپنے پاؤں کی آہٹ سے بھی گھبرا سا جاتا ہے
اگر پتّہ کوئی کھڑکے تو یہ تھرّا سا جاتا ہے

جہاں، ہم ہیں
وہاں پر رات بھی جیسے مُنادی کر کے آتی ہے
بِگل باجوں، گرجتے ہُوٹروں کی پیشوائی میں
یہ توپوں کی سلامی سے سفر آغاز کرتی ہے

اسے چہرہ دکھانے کو بھی سڑکوں پہ لوگوں کا ہجوم ایسے اُمڈتا ہے
کہ شہ کے جان نثاروں کو کُمک منگوانا پڑتی ہے

جہاں ہم ہیں
وہاں قانون کو اپنی حفاظت کے لئے کوئی ادارہ ہی نہیں ملتا
کہ ایسے سب ادارے
اپنے اپنے دفتروں کے گِرد رستوں پر
رکاوٹ در رکاوٹ کا، حصارِ آہنی تعمیر کر کے چُھپ کے بیٹھے ہیں
مگر پھر بھی کہیں سے کوئی دہشت گرد راستہ کاٹ جاتا ہے
تو پھر یہ اک نئے قانون کی چھتری بناتے ہیں
سو دستی فون کی سروس کبھی گھنٹوں کبھی دن بھر وطن میں بند رہتی ہے

جہاں ہم ہیں
وہاں پر مسجدوں میں دِین کی تعلیم، پیچھے
اور اُس مسجد کا مسلک آگے رہتا ہے
نمازی اب بھی آتے ہیں
مگر اب داخلے کے گیٹ پر اُن کو
تلاشی کے مراحل سے گزر کر آنا پڑتا ہے
کہ اب وہ سب نمازیں خوف کے پہرے میں پڑھتے ہیں

نبیؐ کے پاک منبر سے
دعا اور التجا کی اک مسلسل گڑگڑاہٹ کے سوا کچھ بھی
سنائی اب نہیں دیتا
کہ سارے مَسلکوں کو غیر ملکوں سے ملے چندے
اور اُن کی بے ثمر کج بحثیوں نے گھیر رکھا ہے
عمل اور علم دونوں کو یہ شائد دِین سے باہر سمجھتے ہیں!

جہاں ہم ہیں
وہاں غُربت اک ایسا جُرم ہے جس کی معافی ہو نہیں سکتی
کہ سارے زور آور مالکوں کی سرد آنکھوں میں
بنی آدم اور اُن کے ڈھور ڈنگر، ایک جیسے ہیں
یہ جن پر ظلم کرتے ہیں
انہی سے ووٹ لے کر ایسے ایوانوں میں جاتے ہیں
جہاں آئین رہتا ہے
جہاں مظلوم کے حق کے لئے قانون بنتے ہیں
یہ اک ایسی عدالت ہے
جہاں قاتل ہی منصف ہے، وکیلِ استغاثہ بھی
گواہی بھی اُسی کی ہے
ہر اِک رُت میں یہی ناٹک یہاں دن رات چلتا ہے
فقط ایکٹر بدلتے یا پرانے پوسٹر تبدیل ہوتے ہیں

اگرچہ لوگ کہتے ہیں کہ ہاتھوں کی
یہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں
مگراب اس کا کیا کیجیے
کہ جب لقمہ اُٹھانا ہو
تو یہ بے ساختہ اک دوسرے سے مِل بھی جاتی ہیں
کسی ''مشترکہ مقصد'' کے لیے حِصّہ بٹاتی ہیں

جہاں ہم ہیں
وہاں پران دنوں اک میڈیا[1] کے مافیا کی حکمرانی ہے
جو کہتا ہے
اُسے اِس اژدھے کا پیٹ بھرنا ہے
اسے ریٹنگ[2] کی ڈبہ بند ڈائٹ[3] چاہیے ہر پَل
اگراس تک رسائی میں
کوئی کلچر، کوئی مذہب، روائت یا کوئی تہذیب
قدموں کے تلے آئے
تو اس کو روندنا برحق ہے، جائز ہے، ضروری ہے
رہی یہ بحث کہ اقدار پر مبنی
اصولوں کا یہاں دن رات قتلِ عام ہوتا ہے

(1) Media (2) Rating (3) Diet

تو ہم اس میں نہیں پڑتے کہ بزنس وہ کسوٹی ہے
جسے ایسی گواہی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی

جہاں ہم ہیں
وہاں پر زندگی آہستہ چلتی ہے
زمانہ اُس کی نسبت تیز تر ہے اس لئے یہ
درمیاں کا فاصلہ دن رات بڑھتا ہے
نہ یہ اُلجھن سلجھتی ہے نہ کوئی پُل ہی بنتا ہے!

چلو مانا، چلو مانا یہی سب کچھ
ہمارے دور کی زندہ حقیقت ہے
(جسے تسلیم کرنے کے سوا چارا نہیں کوئی)
بہت ہی دُور سے لیکن ہمارے کان میں
اک اور بھی آواز آتی ہے
"کہ یہ زندہ حقیقت آج کا سب سے مکرّم سچ سہی لیکن
سُنو، یہ دائمی کب ہے؟"
کہ اس سے قبل بھی کچھ تھا کہ اس کے بعد بھی کچھ ہے!

جہاں ہم ہیں
وہاں ہر سُو کسی بُھولی روائت کے پرانے رنگ بکھرے ہیں

مگر جو غور سے دیکھیں
یہیں پر آنے والے دور کی ''زندہ حقیقت'' کے
نئے امکان بھی ہوں گے
نئی صبحوں کے دامن میں نئے اعلان بھی ہوں گے!

جہاں ہم ہیں
وہاں اک خوبصورت موڑ کا ہونا بھی ممکن ہے
اسی مٹی میں پوشیدہ کہیں سونا بھی ممکن ہے!

کشش

حُسن تحسین کا نہ طالب ہو
یہ تو اس دہر میں ہے ناممکن
عشق ہو وصل کا نہ خواہش مند
ایسا ہونا یہاں ہے، کیا ممکن!

ہے کشش کے اصول پر قائم
زندگی کا ہر ایک پیمانہ
آتے جاتے ہر ایک لمحے میں
ہے ازل کے ظہور سے جاری
باہمی اُنس کا یہ افسانہ

کیوں ستارے خلاء میں رہتے ہیں
ایک ایسی کشش کے رشتے میں
جو انہیں بے قرار رکھتی ہے
ہر زمانے کی دُھوپ چھاؤں میں
اَن بنی، اجنبی فضاؤں میں

دلِ انساں سے کہکشاؤں تک
خاک کی تہہ میں پلتے بیجوں کو
ٹھیرنے کون شے نہیں دیتی!
چاندنی کی کشش سے مچتی ہے
کیسی یہ پانیوں میں ہلچل سی!

اس تعلق کی ہیں علامت ہم
چاندنی تم ہو، میں سمندر ہوں
اور اِک باہمی کشش کے سبب
دو ستارے ہیں، دیکھنے میں ہم
ہے مگر ایک ہی مدار اپنا
تم مرے، میں تمہارا محور ہوں
روزِ اوّل سے ہم سفر ہیں ہم
تم بھی اس دائرے کے اندر ہو
میں بھی اس دائرے کے اندر ہوں

نظم بننے لگی

جب کبھی بے گُماں، بات سُوجھی کوئی
بے ارادہ اُسے ذہن میں رکھ لیا
پھر اچانک کسی اور ہی بات سے
آپ ہی آپ سے
بات سے بات کا یوں سِرا مل گیا
حرف جُڑتے گئے، لفظ ملتے گئے
دل کے اندر کہیں رُت بدلنے لگی
دیکھتے دیکھتے، پاؤں چلنے لگی
نظم بننے لگی

ایک مصرعے کو جب راستہ مل گیا
بے سہارے کو جیسے خدا مل گیا
استعارے کئی
خود بخود آ گئے آمنے سامنے
اور کچھ دیر میں، بِھیڑ سی لگ گئی
دل کی دہلیز پر
پھر اُسی ایک مصرعے کی انگلی پکڑ
اک رواں بحر میں، جانے کس لہر میں
اجنبی اک مسافر نے دستک جو دی
شہرِ امکان کے بابِ اظہار پر
ایک سے اک نیا باب کُھلنے لگا
روشنی چلمنوں سے نکلنے لگی
ہم کھڑے رہ گئے، راہ چلنے لگی
نظم بننے لگی

غزل

کوئی بھی چیز حسبِ حال نہیں
زندگی کیا ہے، گر وبال نہیں!

نہیں جُھکتی کسی کی دہشت سے
آنکھ جو خُوگرِ سوال نہیں

اُس کی رائے ہو معتبر کیسے!
جِس کی سوچوں میں اعتدال نہیں

غم نہیں ساتھ چل نہ پائے ہم
دُکھ تو یہ ہے اُسے ملال نہیں

بات ہے، یہ بدل بھی سکتی ہے
یہ مقدّر کی کوئی چال نہیں

خامشی سی نہیں کوئی تلوار
مسکراہٹ سی کوئی ڈھال نہیں

رکھ کے ہونٹوں پہ ہاتھ، وہ بولا
مرثیہ ہے! یہ عرضِ حال نہیں

تم ہمارے تھے، بات کل کی ہے
اِس کو گزرے ہزاروں سال نہیں!

جس کا کوئی جواب ہی ناں ہو
جگ میں ایسا کوئی سوال نہیں

اِس پہ ٹھہرا ہے میرا مستقبل
باتوں باتوں میں بات، ٹال نہیں

کیا بتائیں تمہیں کہ کیا ہے حال
بس سمجھ لو کہ کوئی حال نہیں

اُس کی تشریح کس طرح سے ہو
جس کی امجدؔ کوئی مثال نہیں

غزل

جس میں ہوں سب نہال، کہیں ہے بھی تو نہیں
وہ شہرِ بے مثال، کہیں ہے بھی تو نہیں

میری طرف سے معذرت! پر ایک سا رہے
ایسا کوئی ملال، کہیں ہے بھی تو نہیں

لِکھّا ہے کائنات کی ہر شے پہ جس کا نام
وہ خالقِ جمال، کہیں ہے بھی تو نہیں

کیسا ہے وہ، قریب سے دِکھتا ہے کس طرح
اُس کی کوئی مثال، کہیں ہے بھی تو نہیں

جو زخم وقت دیتا ہے، بھرتا ہے آپ ہی
کچھ ان کا اندمال، کہیں ہے بھی تو نہیں!

چُھپ کر فنا کے خوف سے جائے کہاں کوئی
بچنے کا احتمال، کہیں ہے بھی تو نہیں

دھوکے میں خواہشوں کے کوئی آ گیا تو کیا
ایسا حسین جال، کہیں ہے بھی تو نہیں

مانا کہ اعتدال ہی رمزِ حیات ہے
لیکن وہ اعتدال، کہیں ہے بھی تو نہیں

کیسے کہیں کہ ٹوٹے گا ظلمت کا یہ نظام
آمادۂ زوال، کہیں ہے بھی تو نہیں!

پِھر کیا، جو عقل دے نہ سکی آج تک جواب
اس طرح کا سوال، کہیں ہے بھی تو نہیں

کیسے کسی کی یاد کا چہرہ بنائیں ہم
جیسا ہے اپنا حال، کہیں ہے بھی تو نہیں

جو روک لے غنیم کے ہر ایک وار کو
دنیا میں ایسی ڈھال، کہیں ہے بھی تو نہیں

ہم کیا کریں کہ دہر کے جنگل میں آپ سا
رَم آشنا غزال، کہیں ہے بھی تو نہیں!

کیسے کہیں درست ہے دنیا کی جنتری
اس میں وہ ایک سال، کہیں ہے بھی تو نہیں

امجدؔ جو بڑھ کے روک لے گردش کو وقت کی
ایسا کوئی کمال، کہیں ہے بھی تو نہیں

روبوٹ

مجھے فطرت کے حسنِ بے نہایت سے محبت ہے
کہ میں خود اس کا حصہ ہوں
اسی کی بے کناری میں مجھے حیران رہنے دو

مجھے روبوٹ بننے سے، بہت ہی خوف آتا ہے
مری آسانیوں کے واسطے اے مہربانو تم
یہ اب جو لے کے آئے ہو یہ سب سامان رہنے دو

نہ چھینو مجھ سے میرے خواب کی یہ اَن بنی دُنیا
مرے رشتے، مرے ہم دم
کتابیں، شاعری، موسم

مسلسل پھیلتی خوشبو ازل کے ایک لمحے کی
کئی بُھولے ہوئے چہرے، کسی آواز کی رِم جھم

مجھے روبوٹ کی صورت
مشینی زندگی کی بے ثمر بھٹّی میں مت ڈالو
مری پہچان رہنے دو
مجھے انسان رہنے دو

غزل

پردے ہیں لاکھ پھر بھی نمودار کون ہے!
ہے جس کے دم سے گرمئ بازار، کون ہے!

وہ سامنے ہے پھر بھی دکھائی نہ دے سکے
میرے اور اُس کے بیچ یہ دیوار، کون ہے!

باغِ وفا میں ہو نہیں سکتا یہ فیصلہ
صیّاد یاں پہ کون، گرفتار کون ہے!

مانا نظر کے سامنے ہے بے شمار دھند
ہے دیکھنا کہ دُھند کے اُس پار، کون ہے!

کچھ بھی نہیں ہے پاس پہ رہتا ہے پھر بھی خوش
سب کچھ ہے جس کے پاس وہ بے زار، کون ہے!

یوں تو دکھائی دیتے ہیں اَسرار ہر طرف
کھلتا نہیں کہ صاحبِ اَسرار، کون ہے!

امجدؔ الگ سی آپ نے کھولی ہے جو دُکاں
جنسِ ہنر کا یاں پہ خریدار، کون ہے!

ایک اَن بنے شہر کا مرثیہ

ایک ہی شہر کے ملبے سے نئے شہر جنم لیتے ہیں
وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے صُورت ان کی
بام ودَر بھی، سحر وشام بھی، باشندے بھی!

ہر نئے شہر میں کچھ دیر پرانی گلیاں
دُور جاتی ہوئی یادوں کی طرح
ساتھ چلتی ہیں مگر
پھر کسی ٹوٹتے منظر میں بدل جاتی ہیں
نئی تعمیر کی خوش رنگ گزرگاہوں سے
کوئی جاتا ہی نہیں ان کی طرف

شہر والوں کے لئے یہ بھی غنیمت ہے بہت
دُور دیسوں سے جو سیّاح کبھی
دیکھنے اِن کو چلے آتے ہیں

میں جہاں رہتا ہوں اُس شہر کی دیواریں بھی
اپنے مرتے ہوئے حصّوں کو نہیں جانتی ہیں
ان کی اینٹوں میں دراڑیں تو نظر آتی ہیں
پھر بھی قائم ہیں ابھی دروازے

مسئلہ میرا مگر ان کے در و بام نہیں
روزِ روشن کی طرح مجھ پہ حقیقت ہے عیاں
ان کے گِرنے کا عمل اب نہیں رکنے والا

میں تو اُس شہر کو روتا ہوں کہ جو
زندگی بھر مِری آنکھوں، مِرے خوابوں میں رہا
اور میں نے جسے دیکھا بھی نہیں!
کیا عجب شہر ہے وہ شہر کہ جو
کبھی پیدا نہ ہوا
(تھا جو موجود مگر پھر بھی ہویدا نہ ہُوا)
اپنے ہی خواب کی تعبیر سے جو ڈر بھی گیا

سانس لینے بھی نہ پایا تھا کہ وہ مر بھی گیا

اُس نئے شہر کو بننا تھا اِسی شہر کے ملبے سے مگر
خواب کے شہر کا ملبہ کوئی ہوتا ہی نہیں !
دیکھنے آتا نہیں کوئی بھی سیّاح اِسے
اس کی تعمیر کا نقشہ کوئی ہوتا ہی نہیں !
سُن تو لیتے ہیں سبھی لوگ کہانی، لیکن
کوئی اِس شہر کی تقدیر پہ روتا ہی نہیں !

غزل

ترے اِرد گِرد وہ شور تھا، مِری بات بیچ میں رہ گئی
نہ میں کہہ سکا نہ تُو سُن سکا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

مرے دل کو درد سے بھر گیا، مجھے بے یقیں سا کر گیا
ترا بات بات پہ ٹوکنا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

ترے شہر میں مِرا ہم سفر، وہ دُکھوں کا جمِّ غفیر تھا
مجھے راستہ نہیں مل سکا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

وہ جو خواب تھے مِرے سامنے، جو سراب تھے مِرے سامنے
میں اُنہی میں ایسے اُلجھ گیا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

عجب ایک چُپ سی لگی مجھے، اسی ایک پَل کے حِصار میں
ہُوا جس گھڑی ترا سامنا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

کہیں بے کنار تھی خواہشیں، کہیں بے شمار تھی اُلجھنیں
کہیں آنسوؤں کا ہجوم تھا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

تھا جو شور میری صداؤں کا، مِری نیم شب کی دعاؤں کا
ہُوا مُلتفت جو مِرا خدا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

تری کھڑکیوں پہ جُھکے ہوئے، کئی پُھول تھے ہمیں دیکھتے
تری چھت پہ چاند ٹھہر گیا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

مِری زندگی میں جو لوگ تھے، مِرے آس پاس سے اُٹھ گئے
میں تو رہ گیا اُنہیں روکتا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

تری بے رُخی کے حِصار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
میرا سارا وقت نکل گیا، مِری بَات بیچ میں رہ گئی

مجھے وہم تھا ترے سامنے، نہیں کُھل سکے گی زباں مِری
سو حقیقتاً بھی وہی ہُوا، مِری بات بیچ میں رہ گئی

غزل

گزرتے وقت کا نوحہ سُنا ہی کیوں جائے!
جو کام بس سے ہو باہر کِیا ہی کیوں جائے!

یہ آئے دن کا تماشہ یہاں لگائیں کیوں
تمام شہر کا ذِمّہ لیا ہی کیوں جائے!

جو زندگی ہو فقط ماہ و سال کی گِنتی
تو یہ حساب کا پرچہ، دِیا ہی کیوں جائے!

جو اپنے پاؤں سے رستے نہیں بنائے ہوئے
سوال یہ ہے کہ اُن پر چلا ہی کیوں جائے!

کوئی بھی زیست کا مقصد اگر نہیں بھائی
تو کیوں اُٹھائیں یہ احساں، جِیا ہی کیوں جائے

ہے احتجاج کی صُورت، خموش رہنا بھی
جو لفظ دِل سے نہ نکلے، کہا ہی کیوں جائے!

جہاں خلوص نہ اُلفت، نہ دید ہے نہ لحاظ
تو ایسے شہر میں امجد رہا ہی کیوں جائے!

بازگشت

کسی بھی گھر کے آنگن میں جو ہنستا ہے کوئی بچہ
تو اس کی گُونج، خوشبو کی طرح
سب منظروں میں پھیل جاتی ہے
فرشتوں کے پَروں کی پھڑ پھڑاہٹ سی
زمیں کے خاکداں سے آسماں کی بے کرانی تک
سنائی دینے لگتی ہے

نہیں جس کا کوئی ثانی یہ قدرت کا وہ تحفہ ہے
کہ بچے کی ہنسی ابرِ بہاری کا وہ جھونکا ہے
کہ جس کی آستینوں میں وہ سارے رنگ ہوتے ہیں
جو مِل جائیں تو اک ایسی دھنک تشکیل پاتی ہے
کہ جس سے مِلتا جُلتا کوئی منظر بن نہیں سکتا

یہ سینوں میں مُسرّت کی نئی بیلیں اُگاتی ہے
ہمیں پھر سے ہمارا گمشدہ چہرہ دکھاتی ہے

کبھی کے بُجھ چکے جذبوں کے آتشدان میں پھر سے
نئے شعلے بھڑکتے ہیں
بناوٹ سے جو خالی تھی
پھر اپنی رُوح میں وہ ''زندگی'' محسوس ہوتی ہے
کہ بچے کی ہنسی میں ہے عجب جادو کا منتر سا
کہ اِس کو جو بھی سنتا ہے
اُسے یہ ہُو بہو اپنی ہنسی محسوس ہوتی ہے

غزل

کوئی دریا میں ہو کہ ناؤ میں
سب ہیں اس وقت کے بہاؤ میں

آگ اندر کی ہے کہ باہر کی!
کچھ نہیں سُوجھتا الاؤ میں

شہر میں آ گئے مضافاتی
بتّیاں دیکھنے کے چاؤ میں

پھر کسی چارہ گر کی یاد آئی
بہتری آ چلی تھی گھاؤ میں

اُس کو دل سے لگا نہیں لیتے
بات جو ہو گئی ہو تاؤ میں

بِک رہی ہے اصول کی عزت
آج کل کوڑیوں کے بھاؤ میں

سُوجھتے ہیں نئے نئے مضموں
ہو طبیعت اگر اُٹھاؤ میں

یہ محبت عجیب بازی ہے
رُخ بدلتی ہے ایک داؤ میں

جو حقیقت میں دوست ہوں امجدؔ
لاگ رکھتے نہیں لگاؤ میں

غزل

افلاک پہ سجتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!
بہروپ بدلتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

جس آگ کو روشن کرنے کی غائت بھی انہیں معلوم نہیں
اُس آگ میں جلتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

جب سامنے کچھ منظر بھی نہیں اور اَن ہونی کا ڈر بھی نہیں
آنکھوں کو ملتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

کیوں دنیا سے منہ موڑ لیا، کس چاند سے رشتہ جوڑ لیا!
پلکوں پہ لرزتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

نظروں میں کوئی منزل بھی نہیں، دریا بھی نہیں، ساحل بھی نہیں
بے کار بھٹکتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

سوچوں سے اُدھر، نظروں سے پرے، اک باغ کہیں موجود ہے کیا
خوشبو میں ڈھلتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

جب ان کی کوئی تعبیر نہیں، جب کُھلتی یہ زنجیر نہیں
خوابوں میں چمکتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

جب ان سے کوئی رشتہ بھی نہیں، بندھن بھی نہیں، ناتا بھی نہیں
تقدیر بدلتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

کیا ان کے جہاں میں بھی امجدؔ قانون ہے دھرتی والوں کا
تاروں کو نِگلتے رہتے ہیں دن رات مسلسل تارے کیوں!

دُنیا اور ہم

جب تک ہے سطحِ آب پہ کشتی تو خیر ہے
لیکن کسی طرح جو یہ کشتی میں آ گیا
لازم ہے تھوڑی دیر میں کر دے گا اس کو غرق
فطرت کے اس اصول میں ممکن نہیں ہے فرق
جو چاہے تم کرو!

دنیا کی اور ہماری بھی ایسی ہے کچھ مثال
جب تک رہیں جہان میں کچھ اس طرح رہیں
ہم خود ہوں اس پکارتی دنیا کے بیچ میں
دنیا نہ ہم میں ہو!

جیسے بارش ہو وقفے وقفے سے

ہلکی ہلکی پُھوار کی صُورت
جب کوئی خواب سرسراتا ہے
دھیان کی کھڑکیوں میں دھیرے سے

ذوقؔ صاحب کا کیسا زندہ شعر
ذہن میں گُونج گُونج جاتا ہے

"کس سلیقے سے یاد آتے ہو
جیسے بارش ہو وقفے وقفے سے"

یہ نہ سوچا ہَوا تو اَن پڑھ ہے

درج ہے جن پہ ''پھول مت توڑیں''
اس ہدایت پہ مشتمل ہم نے
درجنوں تختیاں سلیقے سے
باغ میں ہر طرف لگا دی ہیں
یہ نہ سوچا، ہَوا تو اَن پڑھ ہے!

دیدنی ہے یہ مفلسی اپنی

سارے منظر ہیں دھندلے دھندلے سے
کوئی صورت نہیں کہیں پر بھی
جیسے قدریں ہوں عہدِ رفتہ کی
جن کی حاجت نہیں کہیں پر بھی

ایک متروک نوٹ کے مانند
وقت پر جو نہیں گیا بدلا
ہم بھی بازارِ زندگانی میں
ردّی کاغذ کا ایک پرزہ ہیں
جس کی قیمت نہیں کہیں پر بھی

حُسنِ سفر

زندگی کے سفر کا سارا حُسن
اس تذبذب میں ہے کہ آئندہ
آتی صبحوں کے اور شاموں کے، منظروں کا جمال کیا ہوگا!
منزلوں کو قریب لانے میں
دُوریوں کا کمال کیا ہوگا!
کیسی تعبیر ہوگی خوابوں کی
زخم کا اندمال کیا ہوگا!
راستے کیا ہمیں دکھائیں گے؟
ہم انہیں کِس طرح بنائیں گے؟

اس مسافت کا تجربہ ہے عجب
وقت دیتا ہے ہر مسافر کو، ہر قدم پر نیا سبق کوئی

غالب آتی ہے جب تھکن دل پر
دوست پھر حوصلہ بڑھاتے ہیں
زمزمے جو کہیں تھے پوشیدہ
اُن کو لفظوں میں ڈھال لاتے ہیں

یہ وہ رستہ ہے جس پہ دشمن بھی
اپنی نیّت کی تیرگی کے سبب
لاکھ تاریکیاں بچھاتے ہیں
پھر بھی یہ راستہ نہیں رکتا
روشنی اور بڑھتی جاتی ہے مشعلیں جس قدر بُجھاتے ہیں
اپنی کمزوریوں سے لڑنے کی ہم میں ہمت نئی جگاتے ہیں

زندگی کے سفر کا سارا حسن بس اسی کشمکش میں مِلتا ہے
یہ وہ غنچہ ہے جو کبھی آتش اور کبھی پانیوں میں کِھلتا ہے

غزل

کِھلتے ہوں پھُول، اُس پہ ہو موسم بہار کا
پھر دیکھنے کی چیز ہے عالم بہار کا

پھُولوں کی آستین سے زِنداں کی باڑ تک
کھُلتا چلا ہی جاتا ہے پرچم بہار کا

خوشبو کی یہ پھوار ہے قاصد بہار کی
رنگوں کا یہ وفور ہے محرم بہار کا

غنچے تھے نیم جان تو طائر تھے دم بخود
ایسا بھی ہم نے دیکھا ہے موسم بہار کا

سنتی ہیں کان کھول کے پھُولوں کی پتّیاں
پیغام لے کے آئی ہے شبنم، بہار کا

شائد انہیں ستاتی ہے بچھڑے ہوؤں کی یاد
کرتے ہیں خار ذکر جو، پیہم بہار کا

ڈالی ہیں اس کے پاؤں میں خوشبو نے بیڑیاں
رنگِ چمن ہے کیا کوئی مجرم بہار کا!

جس کی ہوا میں جھومتے گاتے پھریں گے ہم
آئے گا کب وہ لوٹ کے موسم بہار کا

امجدؔ جہان بھر کو ملی صحبتِ چمن
آیا ہمارے حصے میں ماتم بہار کا

ہاں یہی وقت ہے

غنچے پسِ بہار اگر کِھل گئے تو کیا!
دن میں اگر چراغ کہیں جَل گئے تو کیا!

ملنے کا لطف جب ہے اگر وقت پر مِلیں
کِھلنے کا لطف تب ہے اگر وقت پر کِھلیں

آتا نہیں پلٹ کے جو منظر بکھر گیا
جیسے وہ ایک بات جو باتوں میں کھو گئی
جیسے پُلوں کے نیچے سے پانی گزر گیا

ملنا اگر ہے دوست تو اِس پَل میں آ کے مِل
جذبے ابھی مرے نہیں، زندہ ابھی ہے دِل

شکست کا راز

کھیل میں اس طرح بھی ہوتا ہے
جو ہو آخر میں جیتنے والا
گر بھی سکتا ہے چند لمحوں کو

اس کی افتادگی سے ظاہر ہے
گر کے اُٹھنا ہے کھیل کا حِصّہ
ہار دراصل ہے وہی لمحہ
جو ہمیں دُور ہم سے لے جائے
جس کے سائے میں گرنے والے کے
دل کی ہمت جواب دے جائے

دوست

وہ تو بس ایک مِلنے والا ہُوا
جو کسی ساعتِ ضرورت میں
اپنی مصروفیت کے اندر سے
ہم کو کچھ پَل نکال کر دے دے

دوست وہ ہے کہ جب ہمیں اُس کے
دستِ امداد کی ضرورت ہو
وہ ہماری طرف بڑھے ایسے
ایک لمحے کو بھی اُسے اپنی
کوئی مصروفیت نہ یاد آئے

غزل

زمیں ہے سخت بہت زندگی کے رستے میں
ہزار غم ہیں یہاں اک خوشی کے رستے میں

چلا ہے کتنے قدم ایک، دوسرا کتنے!
یہ سب حساب کہاں، دوستی کے رستے میں

پھر اس کے بعد ابد تک زمان ہے نہ مکاں
خودی ہے ایک قدم، بے خُودی کے رستے میں

تری جدائی نے یہ بھید آشکار کیا
کسی کا کوئی نہیں بے کسی کے رستے میں

خدا سے جو نہیں مانگے وہ سب سے مانگتا ہے
یہ راز ہم پہ کھلا آگہی کے رستے میں

کئی اندھیروں کے رستے میں روشنی تھی بہت
کئی اندھیرے ملے روشنی کے رستے میں

خود اس کے اپنے بھی اندر ہے اک نئی دنیا
یہ بحر و بر ہی نہیں آدمی کے رستے میں

یہ کیسی لَو تھی کسی گمشدہ چراغ کی، جو
سدا بلند رہی تیرگی کے رستے میں

نہ اپنی راہ کسی کو بھی روکنے دیجے
نہ آپ آیئے امجدؔ کسی کے رستے میں

غزل

آنکھیں شکستِ دل کی اگر ترجماں نہ ہوں
ہم بھی خدا مثال کسی پر عیاں نہ ہوں

تنہائی سے شدید نہیں جو بھی ہو عذاب
منزل سے لاکھ دُور ہوں، بے کارواں نہ ہوں

شیشے میں بال آیا تو سمجھو کہ وہ گیا
رکھیے خیال! دوست کبھی بدگماں نہ ہوں

کیوں اِس قدر ہجوم ہے تاروں کا اُس طرف
ٹکرائے کہکشاؤں میں سیارگاں نہ ہوں!

مولا جو بے وقاری ہی لکھی ہے بخت میں
رکھنا وہاں کہ جاننے والے، جہاں نہ ہوں

نظریں اُٹھا کے جو نہیں منزل کو دیکھتے
یہ رہ گزارِ شوق کے اُفتادگاں نہ ہوں!

لفظوں کی دیکھ بھال سے بنتی ہے شاعری
مہکیں گے کیسے باغ، اگر باغباں نہ ہوں

امجدؔ میں ہوں تلاش میں ایسے جہان کی
جس میں کہ یہ زمین نہ ہو، آسماں نہ ہوں

کب تک

کب تک ہو ایسے وقت کا شکوہ، جو جا چکا
کب تک ہو اُن دنوں کی کہانی، جو کھو گئے!

ماضی میں جو ہُوا سو ہُوا، دیکھنا ہے یہ
آتے دنوں کے ساتھ سفر، کس طرح سے ہو!
کانٹے جو اپنے سامنے بکھرے ہیں جا بجا
اب صاف ان سے راہ گزر، کس طرح سے ہو!
دیکھے تھے جِن نے خواب وہ آنکھیں تو بُجھ چکیں
تعبیر اب بہ رنگِ دگر، کس طرح سے ہو!
کرتا نہیں ہے وقت کسی کا بھی انتظار
ہر دن "نیا" ہے جاگتی آنکھوں کے واسطے
لیکن یہ خُفتگاں کو خبر، کس طرح سے ہو!

جس میں تھے ہم گِھرے ہوئے وہ شب گزر گئی
پہلی کرن یہ مہر کی کہتی ہے کان میں
''اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر، گئی''

غم کی طویل رات میں گُم، سو لئے بہت
ماتم کی صف لپیٹیے اب رو لئے بہت

زندگی

کیسی ہے یہ کتاب!
دو ہی وَرق ہیں اور ہیں
دونوں ہی انتخاب
جِینا بھی اک سراب ہے
مرنا بھی اِک سراب!

غزل

سینکڑوں ہی رہنما ہیں، راستہ کوئی نہیں
آئنے چاروں طرف ہیں، دیکھتا کوئی نہیں

سب کے سب ہیں اپنے اپنے دائرے کی قید میں
دائروں کی حد سے باہر سوچتا کوئی نہیں

صرف ماتم اور زاری سے ہی جس کا حل مِلے
اس طرح کا تو کہیں بھی، مسئلہ، کوئی نہیں

یہ جو سائے سے بھٹکتے ہیں ہمارے اِرد گِرد
چُھو کے ان کو دیکھئے تو، واہمہ کوئی نہیں

جو ہُوا یہ درج تھا پہلے ہی اپنے بخت میں
اِس کا مطلب تو ہُوا کہ بے وفا کوئی نہیں!

تیرے رستے میں کھڑے ہیں صرف تجھ کو دیکھنے
مدّعا پُوچھو تو اپنا مدّعا کوئی نہیں

"کُن فکاں" کے بھید سے مولا مجھے آگاہ کر
"کون ہُوں میں" گر یہاں پر دوسرا کوئی نہیں!

وقت ایسا ہم سفر ہے جس کی منزل ہے الگ
وہ سرائے ہے کہ جِس میں ٹھیرتا کوئی نہیں

گاہے گاہے ہی سہی امجدؔ مگر ہے واقعہ
یُوں بھی لگتا ہے کہ دنیا کا خدا کوئی نہیں

غزل

کوئی بھی شکل آخری نہ سمجھ
اس پڑاؤ کو زندگی نہ سمجھ

کوئی مطلب ہے اس تغافل کا
اس "توجّہ" کو سرسری نہ سمجھ

مجلسی اُس کی مسکراہٹ کو
صرف اپنے لئے، کبھی نہ سمجھ

عِلم کا راستہ نہیں آساں
ہر تماشے کو آگہی نہ سمجھ

ایک دھوکا ہے صبحِ کاذب بھی
اس دھندلکے کو روشنی نہ سمجھ

اس میں جاں کا زیاں بھی ممکن ہے
دل لگانے کو دل لگی نہ سمجھ

میں جو جُھک جُھک کے بات کرتا ہوں
اس کو احساسِ کمتری نہ سمجھ

ہیں عبادات، صرف آدھا سچ
ان کو تکمیلِ بندگی نہ سمجھ

ہر مسافر کی اپنی منزل ہے
ساتھ چلنے کو ہمرہی نہ سمجھ

عشق کے اور بھی تقاضے ہیں
ہر تعلق کو عاشقی نہ سمجھ

رُوح کی کھڑکیاں نہ جو کھولے
اُس کو اے دوست آگہی نہ سمجھ

یہ ہُنر بھی ہے اور فن بھی ہے
بِکھرے لفظوں کو شاعری نہ سمجھ

خواب رستہ بدل بھی لیتے ہیں
ہر تمنّا کو زندگی نہ سمجھ

فرق امجدؔ ہے صرف کہنے میں
اَن کہی کو بھی اَن کہی نہ سمجھ

غزل

مٹی کا ایک ڈھیر تھا اور بُجھتا دِیا تھا
پھر کس کو خبر کون، کہاں، کیسے جیا تھا!

تھا کچھ بھی نہیں اور تو پھر کس لیے رکتے
جو دیکھنے لائق تھا وہ سب، دیکھ لیا تھا!

بس اُس کی حفاظت کے لیے جیتے رہے ہم
وہ زخم جو اک دوست نے تحفے میں دیا تھا

اس بار وہ لوٹے تو وہاں شہر تھا آباد
جنگل سے کوئی عہد پرندوں نے کیا تھا!

کیوں پیڑ جدا اور جدا اِن کے ثمر ہیں
پانی تو سُنا ایک ہی بادل سے پیا تھا!

لہرانے لگے چاروں طرف رنگ دھنک کے
میں نے تو ابھی آپ کا بس نام لیا تھا

پھر اس کے عوض جو بھی سزا ہو، مجھے منظور
بس اتنا بتا دیجیے، کیا میں نے کِیا تھا؟

پڑتی تھی اُسے دیکھ کے سورج کی چمک ماند
کُٹیا میں جو درویش کی، مٹی کا دِیا تھا

اے منُجّم مِرا ستارہ دیکھ!

اے منّجم مِرا ستارہ دیکھ!
تجھ کو شائد یہ بات یاد نہ ہو
بات ہے بھی بہت پرانی یہ
تیسویں سال میں تھا میں اُس وقت
(اور ستّر کا ہو رہا ہوں اب)

تُو نے مجھ سے مرے ہی بارے میں
کچھ عمومی سوال پوچھے تھے
اور اِک زائچہ بنایا تھا
ٹھیک لگتی تھیں بیشتر باتیں
جن کا رشتہ تھا میرے ماضی سے
آنے والے دنوں کے بارے میں
جتنی باتیں تھیں وہ بھی اچھی تھیں
(اور کچھ تو بہت ہی اچھی تھیں)

تُو نے مژدہ مجھے سنایا تھا
نیک نامی کا اور عزّت کا
میری تحریر کے توسّط سے
ملنے والی ہر اک سہولت کا
اور اُس بے شمار شہرت کا
جو کہیں میرے انتظار میں تھی

دل تو خوش تھا مگر دماغ میں یہ
وسوسے بار بار آتے تھے،
"اِن ستارہ شناس لوگوں میں
یہ ہنر بیشتر کا پیشہ ہے
سلسلہ سا ہے روزی روٹی کا
سو جو وہ دیکھتے ہیں اُس میں سے
اچھی باتیں ہی بس بتاتے ہیں
اور پھر اس کی کیا ضمانت ہے!
واقعی یہ کوئی منّجم ہے؟
اور اگر سچ ہے یہ "بصیرت" تو
علم کے اِس اتھاہ سمندر پر
دسترس ہے بھی یا نہیں اِس کو!"

پھر ہُوا یوں کہ ہر نئے دن میں
ایک اک کر کے سب یہ خوش خبریں
شکل میں ''واقعوں'' کی ڈھلتی گئیں
اس گھڑی جو نہ تھا گماں تک میں
اُس کو دیکھا یقین بنتے ہوئے
زندگی کو حسین بنتے ہوئے

آج وہ سب ہے میرے دامن میں
جو مِری سوچ سے بھی باہر تھا
پر وہ دنیا نظر نہیں آتی
جس کے میں خواب دیکھا کرتا تھا

''اب بھی انصاف کو ترستی ہے
بے اماں بِھیڑ، بے وسیلوں کی
ڈھونڈتی آج بھی ہے خلقِ خدا
کوئی تعبیر اپنے خوابوں کی''

یاد ہے مجھ کو تُو نے لکھا تھا
یہ بھی ظاہر ہے زائچے سے ترے

"آنے والے دنوں کی خوشیاں سب
مل کے دیکھیں گے اور بانٹیں گے
شاد ماں ہوں گے ہم سفر بھی ترے
مل کے سب منزلوں پہ پہنچیں گے
سب سے انصاف ایک سا ہوگا
جو بھی بوئیں گے وہ ہی کاٹیں گے"

اے منجّم مِرا ستارہ دیکھ!
وقت کے آئینے سے وہ منظر
کس طرح کٹ کے، رہ گیا ہے کہاں!
جو مری آرزو میں بَستا ہے
اک حقیقت بنے گا کب وہ جہاں؟
اے منجّم ذرا دوبارہ دیکھ!

محبت زندگی ہے

محبت جب دبے پاؤں کسی دل کی طرف آئے
بہت آہستگی سے اُس کے دروازے پہ دستک دے
تو اُس دستک کے جادُو سے
دَرودیوار کی رنگت بس اِک پَل میں بدلتی ہے
فضا کی نغمگی اِک اجنبی خوشبو میں ڈھلتی ہے
تو پھر کچھ ایسا ہوتا ہے
اسی لمحے کی جھلمل میں
بہت ہی سرسری سے اِک تعلق کی ہَوا یک دم
کسی آندھی کی صُورت ہر طرف لہرانے لگتی ہے
وہ اک لمحہ، زمانوں پر کچھ ایسے پھیل جاتا ہے
کہ کوئی حدّ نہیں رہتی

یہ کُھلتا ہے
محبت زندگی کا ایک رستہ ہی نہیں
منزل نشاں بھی ہے
یقینوں سے جو افضل ہو یہ اک ایسا گماں بھی ہے
یہ ایسا موڑ ہے جس پر سفر خود ناز کرتا ہے
اِک ایسا بیج ہے
جو زندگی میں ''زندگی'' تخلیق کرتا ہے
اُسے تعمیر کرتا اور نئے مفہوم دیتا ہے
بتاتا ہے

''محبت زندگی ہے اور جب یہ زندگی
دِن رات کی تفریق سے آزاد ہو جائے
تو ماہ و سال کی گنتی کے وہ معنی نہیں رہتے
جو اَب تک تھے''

سِمٹ جاتے ہیں سب رشتے
اک ایسے سلسلے کی خوش نگاہی میں
کہ اِک دوجے کی آنکھوں میں ہمکتے خواب بھی ہم دیکھ سکتے ہیں
جہاں ہم سانس لیتے تھے
اور جن کی نیلگوں چادر کے دامن میں

ہمارے ''ہست'' کا پیکر سنورتا تھا
وہ صدیوں کے پُرانے، آشنا اور اَن بنے منظر
کئی رنگوں میں ڈھلتے،
خوشبوؤں کی لہر میں تحلیل ہوتے ہیں
زمیں چہرہ بدلتی، آسماں تبدیل ہوتے ہیں

محبت بھی وفا صورت
کسی قانون اور کُلیئے کے سانچے میں نہیں ڈھلتی
کہ یہ بھی انگلیوں کے ان نشانوں کی طرح سے ہے
کہ جو ہر ہاتھ میں ہو کر بھی آپس میں نہیں ملتے
یہ ایسی روشنی ہے
جس کے اربوں رُوپ ہیں لیکن
جسے دیکھو وہ یکتا ہے
نہ کوئی مختلف اِن میں نہ کوئی ایک جیسا ہے!

محبت استعارہ بھی، محبت زندگی بھی ہے
ازل کا نور ہے اس میں، اَبد کی تیرگی بھی ہے
اِسی میں بھید ہیں سارے، اِسی میں آگہی بھی ہے

اَن دیکھے فاصلے

خواہشوں کے سراب زاروں کی
درد نا آشنا مسافت میں
واہموں، وسوسوں کی سنگت میں
راستے بے شمار ملتے ہیں
کوئی منزل مگر نہیں آتی

غم کے دریا کی بے کرانی میں
دُور ہوتے ہوئے کناروں کی
آخری حد نظر نہیں آتی

اپنے اپنے سفر کی وحشت میں
بے یقینی کی حیرتوں میں گُم
اِس طرف ہم ہیں اُس طرف ہو تم

دُعا

دُعا اِک ایسی مشعل ہے
کہ جس کی سرمدی لَو کو
ہَوا کا کوئی بھی جھونکا
کبھی مدّھم نہیں کرتا

قفس کی تیلیوں سے باغ کا منظر نظر آنا
اسیری کی صعوبت کو بڑھاتا ہے
اسے کچھ کم نہیں کرتا
وہ جُھوٹا ہے جو کہتا ہے
کہ وہ اپنے نشیمن سے بچھڑنے پر نہیں روتا
اسے تقدیر کا اک فیصلہ تسلیم کرتا ہے
ذرا بھی غم نہیں کرتا

اُسے کہہ دو، دُعا وہ اسمِ اعظم ہے
جو مٹی کی تہوں میں بھی دریچے کھول دیتی ہے
کہ اس دھرتی کے تختے پر
کوئی زنداں نہیں ایسا جو اس کو روک سکتا ہو
ہر اک موسم بدلنے پر فضا تبدیل ہوتی ہے
مگر پھر بھی

دُعا سا کام دنیا میں
کوئی موسم نہیں کرتا
کہ یہ اک ایسی مشعل ہے کہ جس کی سَرمدی
لَو کو
ہوا کا کوئی بھی جھونکا
کبھی مدھم نہیں کرتا

غزل

ہر منظر گر دھوکا ہے
کون ہے پھر جو سچا ہے

اگلے پَل کے آنے تک
بس یہ لمحہ اپنا ہے

کوئی اُس کی شکل نہیں
جیسا مانو، ویسا ہے

جو بھی کچھ ہے پاس مرے
ایک نظر کا صدقہ ہے

جانے ہر اک منظر کیوں
دیکھا دیکھا لگتا ہے

ایک ہی آگ کا ایندھن سب
صدیاں ہوں یا لمحہ ہے!

اتنی ساری بِھیڑ کے ہوتے
جس کو دیکھو تنہا ہے

مانو یا نہ مانو تم
دنیا، کھیل تماشا ہے

تین کنارے ہیں اس کے
وقت بھی کیسا دریا ہے

مجھ کو جس کی خبر نہیں
میری خبر وہ رکھتا ہے

جو پَرکار سے باہر ہو
ایسا بھی اک نقطہ ہے

شہ سے لے کر پیادے تک
جو بھی ہے اک مہرا ہے

غزل

جو پیشِ نظر، حرف کی حُرمت نہ رہے گی
رہ بھی گئی تحریر تو برکت نہ رہے گی

اُس شب کے تصور سے لرز جاتی ہیں آنکھیں
جب ان کو کسی خواب کی حاجت نہ رہے گی

چاہو گے اگر دادِ ہُنر، بے ہنروں سے
مشہور تو ہو جاؤ گے، عزّت نہ رہے گی

یہ وقت کسی عکسِ گریزاں کی طرح ہے
رہتی ہے کبھی ایک سی صُورت، نہ رہے گی

سہتے ہی چلے جاؤ گے ہر ظلم تو اک روز
سچ بولنے، سننے کی بھی ہمت نہ رہے گی

جینا ہے مرے دوست تو عزّت کے لیے جی
یہ تخت بھی ِگر جائے گا حشمت نہ رہے گی نہ رہے گی

ہر آن سخنِ تازہ کی دنیا ہے طلب گار
باسی ہوا مضمون تو قیمت نہ رہے گی

پانی پہ بنے نقش کی تمثال ہے دنیا
اچھی کہ بُری، کوئی بھی حالت نہ رہے گی

کرنی ہے تو کر آج ہی یہ سمتِ سفر طے
کل تک تو پلٹ جانے کی مہلت نہ رہے گی

پیرزادہ قاسم کے لیے ایک نظم

وقت کے پار، کوئی ہے کہ نہیں!
پسِ دیوار، کوئی ہے کہ نہیں!
جس کا قصہ ہو کہانی سے الگ
ایسا کردار، کوئی ہے کہ نہیں!

ان سوالوں کی گزرگاہ سے اب تک لاکھوں
کارواں، اہلِ ہنر کے گذرے
(بستیاں اُن کی ہیں اب تک روشن)
پھر بھی ایسی کئی تعمیریں ہیں
جن میں آباد نہیں ہے کوئی

تم بھی اے دوست مسافر ہوانہی راہوں کے
جن سے منزل کا نشاں ملتا ہے
اپنے لوگوں کے لیے، ان کی بھلائی کے لیے
تم نے سوچا ہے بہت

اپنے اشعار میں انسان کی حرمت کے لیے

تم نے لکھا ہے، بہت

منتخب لوگ ہیں وہ

جن کے دل اور دماغ

ایک ہی لَے میں سفر کرتے ہیں

جو محبت کو بنا لیتے ہیں مشعلِ جاں

اور آباد نگر کرتے ہیں

جن کو توفیقِ عمل، جراَتِ اظہار ملی

تحفۂ حرف ملا، گرمیٔ افکار ملی

روشنی بانٹتے لوگوں کی تگ و تاز سے جو

ہر زمانے میں نمو پاتی ہے

اُسی تسبیح کے دانے، تم ہو

مجھ کو ہے ناز کہ اس رزم گہہِ ہستی میں

مرے ساتھی، مرے دمساز، پرانے تم ہو!

تم سے اس دور میں الفت کا بھرم ہے مرے دوست!

جو بھی اعزاز ملے تم کو وہ کم ہے مرے دوست!

(جشنِ پیرزادہ قاسم (ہوسٹن) کے موقع پر لکھی گئی)

غزل

کمالِ حُسن ہے حُسنِ کمال سے باہر
ازل کا رنگ ہے جیسے مثال سے باہر

تو پھر وہ کون ہے جو ماورا ہے ہر شے سے!
نہیں ہے کچھ بھی یہاں گر خیال سے باہر!

یہ کائنات، سراپا جواب ہے جس کا
وہ اک سوال ہے پھر بھی، سوال سے باہر

ہے یادِ اہلِ وطن یوں کہ ریگِ ساحل پر
گِری ہوئی کوئی مچھلی ہو جال سے باہر

عجیب سلسلۂ رنگ ہے تمنا بھی
حدِ عروج سے آگے زوال سے باہر

نہ اس کا انت ہے کوئی نہ استعارہ ہے
یہ داستان ہے ہجر و وصال سے باہر

دعا بزرگوں کی رکھتی ہے زخمِ الفت کو
کسی علاج، کسی اندمال سے باہر

بیاں ہو کس طرح وہ کیفیت کہ ہے امجدؔ
مری طلب سے فراواں، مجال سے باہر

19/ مئی

بُرے تھے یا کہ بھلے بِیت ہی گئے سب دن
کسی نے شاد، کسی نے ہمیں اداس کیا
مگر نہ کوئی بھی ٹھہرا طلوعِ شام کے بعد

تو پھر یہ کیا کہ وہ اِک درد بانٹتا ہوا دن
نجانے کب سے مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
مرے وجود میں اک سانپ بن کے پلتا ہے
اس ایک دن سے مری آج تک بنی ہی نہیں
کہ اس کے منہ سے خبر، خیر کی، سُنی ہی نہیں

غزل

صدیاں جن میں زندہ ہوں وہ سچ بھی مرنے لگتے ہیں
دھوپ آنکھوں تک آ جائے تو خواب بکھرنے لگتے ہیں

انسانوں کے روپ میں جس دم سائے بھٹکیں سڑکوں پر
خوابوں سے دِل، چہروں سے آئینے ڈرنے لگتے ہیں

کیا ہو جاتا ہے ان ہنستے، جیتے جاگتے لوگوں کو
بیٹھے بیٹھے کیوں یہ خود سے باتیں کرنے لگتے ہیں

عشق کی اپنی ہی رسمیں ہیں، دوست کی خاطر، ہاتھوں میں
جیتنے والے پتّے بھی ہوں، پھر بھی ہرنے لگتے ہیں

دیکھے ہوئے وہ سارے منظر نئے نئے دکھلائی دیں
ڈھلتی عمر کی سیڑھی سے جب لوگ اُترنے لگتے ہیں

بیداری آسان نہیں ہے آنکھیں کھلتے ہی امجدؔ
قدم قدم ہم سپنوں کے جُرمانے بھرنے لگتے ہیں

بس آج کی شام ہماری ہے

ہستی کے بازار میں اے دِل
کچھ بھی نہیں ہے بے مصرَف
آنکھیں ہوں یا سپنے ہوں!
ہر چیز کی اپنی قیمت ہے ہر شے کے اپنے گاہک ہیں
ہے فرق اگر تو اتنا ہے
اِن میلہ گھومتی آنکھوں میں اک رنگ کہیں لہراتا ہے
جو جس کے مَن کو چُھو جائے وہ اس کے ہی گُن گاتا ہے

یہ کھیل اَزل سے جاری ہے
''کل'' اور کوئی ٹھہرا تھا یہاں
''کل'' اور کسی کو ہونا ہے
اور ''آج'' ہماری باری ہے

ہر آنکھ کی اپنی دنیا ہے ہر آنکھ کے اپنے سپنے ہیں
اِس رنگوں کی پھلواری سے وہ رنگ چنیں جو اپنے ہیں
شام، یہ ڈھلتی شام ہی اے دِل
شائد اپنا حصہ ہے
(یہ گذر گئی تو گذر گئی)
باقی سب ہے ایک کہانی، سُنا ہوا سا قصہ ہے
جو روزِ ازل سے جاری ہے

ہستی کے بازار میں مانا کچھ بھی نہیں ہے بے مصرف
لیکن شرط یہ بھاری ہے
بس آج کی شام ہماری ہے!

غزل

جیسے میں دیکھتا ہوں لوگ نہیں دیکھتے ہیں
ظلم ہوتا ہے کہیں اور کہیں دیکھتے ہیں

جُھوٹ اور سچ کی نشانی بھی نہیں پاس اِن کے
ہر حقیقت کو مگر اپنے تئیں دیکھتے ہیں

سرسراہٹ ہے، نہ آہٹ ہے نہ چُوڑی کی کھنک
کس سلیقے سے ہمیں پردہ نشیں دیکھتے ہیں

تیر آیا تھا جدھر سے، یہ مرے شہر کے لوگ
کتنے سادہ ہیں کہ مرہم بھی وہیں دیکھتے ہیں

جب سے جانا کہ ٹھکانا ہے، یہاں رات کی رات
کیسی حسرت سے مکانوں کو مکیں دیکھتے ہیں

بھُولتے جاتے ہیں طاقت کے جنوں میں کیا کچھ
اپنے بھی نقشِ قدم لوگ نہیں دیکھتے ہیں

بے ہُنر چھپ نہیں سکتے ہیں ہُنر مندوں سے
جوہری ایک نظر میں ہی نگیں دیکھتے ہیں

کچھ علاقہ اُنہیں بے سمت گمانوں سے نہیں
لوحِ تقدیر پہ جو حرفِ یقیں دیکھتے ہیں

کیا ہوا وقت کا دعویٰ! کہ ہر اک اگلے برس
ہم اُسے اور حسیں، اور حسیں دیکھتے ہیں

اُس گلی میں ہمیں یونہی تو نہیں دل کی تلاش
جس جگہ کھوئے کوئی چیز، وہیں دیکھتے ہیں

اُن کو کچھ علم نہیں کون کھڑا ہے سر پر!
جو سدا خود کو سرِ عرش، نشیں دیکھتے ہیں

آسماں زاد ستاروں کو نہیں اس کی خبر
کس عقیدت سے انہیں اہلِ زمیں دیکھتے ہیں

جو بھی لکھا وہ لکھا ہم نے خلوصِ دل سے
ہم کسی اور کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے ہیں

شائد اس بار ملے کوئی بشارت امجدؔ
آیئے اپنے مقدّر کی جبیں، دیکھتے ہیں

غزل

دشتِ بے آب کی طرح گذری
زندگی خواب کی طرح گذری

چشمِ پُر آب سے تری خواہش
رقصِ مہتاب کی طرح گذری

ایک صورت کو ڈھونڈتے ہر شب
چشمِ بے خواب کی طرح گذری

ہجر کی انجمن سے ہر ساعت
اشکِ بے تاب کی طرح گذری

داستاں میری، اس کہانی کے
اَن پڑھے باب کی طرح گذری

دل کے دریا سے ہر خوشی امجدؔ
ایک گرداب کی طرح گذری

بارِ الٰہا

اب تو دونوں تھک سے گئے ہیں
آنکھیں بھی اور منظر بھی
ایک جگہ پر آ کر کب سے
کرداروں کو چُپ سی لگی ہے!
اپنے اپنے جملے سب کو بھول چکے ہیں
اور کہانی رُکی کھڑی ہے!

پردہ آخر کیوں نہیں گِرتا!
ناں کوئی آشا
نَے ہے دلاسا
بارِ الٰہا
کس دم ہو گا!
ختم تماشا۔

وضاحت

یہ اور بات زمانے کی مہربانی سے
ہم اپنے عہد پہ پورے اُتر نہیں پائے!
جو فاصلوں کے سمندر تھے اپنے رستے میں
ہم ان میں ڈُوبے، انہیں پار کر نہیں پائے
نہ اپنے بخت بھلے تھے نہ اپنا وقت بھلا
کہ ڈھب سے جی نہ سکے اور مر نہیں پائے!
تمہارے شہر سے گزرے تو بارہا لیکن
تمہارے شہر میں اک شب ٹھہر نہیں پائے!

کریں تو کس سے کریں اپنی بے کسی کا گِلہ
تمام عمر چلے دشتِ نارسائی میں
تلاش جس کی تھی بس وہ ہی راستہ نہ ملا
وگرنہ ایسے سفرِ مبتلا نہ تھے ہم لوگ
زباں پہ مُہر سہی، بے نوا نہ تھے ہم لوگ
کہ بدنصیب تو تھے، بے وفا نہ تھے ہم لوگ!

غزل

تھی بزمِ یار میں وہ روشنی چراغوں کی
لوؤں سے پھُوٹ رہی تھی خوشی چراغوں کی

بکھرتی رات کے دورانیے کا فرق ہے بس
نہیں بشر سے جدا زندگی چراغوں کی

دکھائی دیتے ہیں جس طرح صبح کو تارے
وہ اُس کو دیکھ کے حالت ہوئی چراغوں کی

کسی کے شہرِ تعلق میں یوں رہے ہم لوگ
ہَوا سے جیسے رہے دل لگی چراغوں کی

تمام عمر کٹی آندھیوں کے رستے میں
تمام عمر رہی، ہمرہی چراغوں کی

جھپک جھپک گئی آنکھیں، نظر نہ کچھ آیا
تھی اتنی تیز وہاں روشنی چراغوں کی

کلام کرتی ہے اُس سے ازل کی حیرت بھی
نصیب جس کو ہوئی آگہی چراغوں کی

ہر ایک اشک میں رقصاں تھا اُس کی یاد کا عکس
ہماری آنکھ تھی گویا گلی چراغوں کی

طرح طرح کے اندھیرے، نظر میں دَر آئے
بہت ہی مہنگی پڑی دوستی چراغوں کی

تمام رات وہ بیٹھا رہا تھا محفل میں
تمام رات چلی شاعری، چراغوں کی

غزل

کسی کے ساتھ جو اِک شام میں گذارا ہے
بس اُتنا وقت ہی اے زندگی، ہمارا ہے

وہی فلک ہے وہی شام ہے پہ لگتا ہے
یہ اور چاند ہے یہ اور ہی ستارا ہے

میرا یقیں نہیں بدلا، بدل گیا سب کچھ
کہ دل ہے میرا مگر حوصلہ تمہارا ہے

ہر ایک شے کو جو اُس کی جگہ پہ رکھ دے گا
وہ آنے والا زمانہ، وہ کل ہمارا ہے

تمام سُود ہیں تیرے، زیاں ہمارے ہیں
یہ کیا حساب ہے! یہ کیسا گوشوارا ہے!

فشارِ دشتِ بلا میں یہ رفتگاں کی یاد
فنا کے رُوپ میں ہستی کا استعارا ہے

نہ کر سکی کوئی آندھی مرا سفر کھوٹا
تمہارے نام کا کیسا عجب سہارا ہے!

ہرا بھرا نہ رہے کیوں چمن تمنّا کا
غموں نے سینچا اسے، درد نے سنوارا ہے

کسی کتاب سے کم تو نہیں، صحیفۂ عشق
جو اُس نے مجھ سے سخن زاد پر اُتارا ہے

یہ کائنات پہیلی سہی مگر امجدؔ
سمجھ سکو تو ہر اک حرف اک اشارا ہے

ہم سفر

سفر کے بیچ میں رستہ اگر بدل جائے
نئے رفیق، نئے دوست مل تو جاتے ہیں
مگر وہ لطف نہیں لوٹتا رفاقت کا
بہار آنے پہ، دورِ خزاں کے جاتے ہی
نئی رُتوں میں نئے پھول کِھل تو جاتے ہیں
پلٹ کے آتا نہیں رنگ پچھلی صحبت کا

ظہور کرتے ہیں وقفے سے پھر وہی موسم
مگر وہ بیتا سماں لوٹ کر نہیں آتا
دکھائی دیتے ہیں اپنی جگہ پہ سب دریا
پر ان کے بیچ سے اک بار جو گذر جائے
وہ رنگِ آبِ رواں پھر نظر نہیں آتا۔

قسطوں میں بٹی زندگی

عدم کو جاتے ہیں ظاہر میں رفتگاں تنہا
مگر جو غور سے دیکھیں تو ان کی قبروں میں
وہ سارا وقت بھی مدفون ہے کہ جو ہم نے
رہِ حیات میں مل کر کہیں گذارا تھا
گئے ہوؤں کی طلب نے ہمیں یہ سمجھایا
فنا کا رنگ ہی ہستی کا استعارا تھا
ہماری عمر کٹی جا رہی ہے قسطوں میں
کہ فائدہ جسے سمجھے وہ سب خسارا تھا۔

مجھے ہی کیوں!

مِرے ہی واسطے کیوں ہے یہ آگہی کا روپ!
دکھائی دیتے ہیں کیوں مجھ کو ہی وہ سب چہرے!
کہ جن کے نقش ابھی پتھروں کے قیدی ہیں
سنائی دیتی ہیں مجھ کو ہی کیوں وہ آوازیں!
زبان جن کی نہیں جانتے، بہت سے لوگ

مجھے ہی کیوں یہ بصیرت ملی کہ میں جانوں!
کلام کرتی ہے کیا خامشی پہاڑوں کی!
سوال کرتی ہیں آنکھیں، یہ کیا ستاروں کی!
گذرتی کیوں ہیں مرے دل پہ دستکیں دے کر
یہ موسموں سے کٹی، آہٹیں بہاروں کی!

مجھی پہ کیوں یہ نوازش ہوئی کہ میں دیکھوں
فریب دیتی ہوئی روشنی نظاروں کی!

کسی کے درد، کسی کی تباہ حالی کے
مری ہی آنکھ پہ کیوں زخم لگتے رہتے ہیں!
مجھے ہی کیوں کسی کروٹ، سکوں نہیں ملتا
مرے جُنوں سے کسی کا جُنوں نہیں ملتا
مجھے ہی کیوں نظر آتے ہیں غم کے مارے لوگ!
ادھوری خواہشوں کے گھاٹ پر اتارے لوگ
مُجھی پہ کس لیے کھُلتے ہیں ظلم کے اَسرار
مُجھی میں کس لیے بستے ہیں بے سہارے لوگ!

مرے وجود کو کھاتی رہے گی کب تک یہ
بھڑکتی آگ، جسے راستا نہیں ملتا
یہ آگ، جس کو ضرورت نہیں ہے ایندھن کی
یہ آگ جس کا کہیں پر سِرا نہیں ملتا

ہر ایک صبح، کسی رات کی طرح مجھ سے
سلوک رکھتی ہے کیونکر گریز پائی کا!

وفا کسی سے، کوئی دوسرا اگر نہ کرے
مجھی کو ڈستا ہے کیوں سانپ بے وفائی کا!
مجھے ہی کیوں یہ خزانہ ملا رفاقت کا!
مجھے ہی کیوں یہ اشارا ہوا جدائی کا!
سُنے جو کوئی حکایت مری تو میں پوچھوں
مجھے ہی کیوں یہ دیا داغ نارسائی کا!

عطا ہوئے یہ یقین وگماں، مجھے ہی کیوں!
مِرے حبیب، مِرے مہرباں، مجھے ہی کیوں!
حفیظ وخالقِ ہر دو جہاں، مجھے ہی کیوں!!

غزل

اس خرابی کا ہے سبب کچھ تو
سیکھیے زندگی کا ڈھب کچھ تو

بے نیازی نہیں وہ اگلی سی
راہ پر آ چلے ہیں اب، کچھ تو

راستہ دیجیے بزرگوں کو
عمر کا چاہیے، ادب کچھ تو

دل جلا کر رکھیں دِیوں کی مِثل
کم کریں تیرگیٔ شب، کچھ تو

موت سے کم نہیں ہے یہ احساس
ہونے والا نہیں ہے اب کچھ تو

عرض تب کیجئے شفاعت کی
جیبِ اعمال میں ہو جب کچھ تو

نام لے کر وہ حال پوچھتے ہیں
اس توجہ کا ہے سبب کچھ تو!

"کُن" کا قصہ تمام کرنے کو
پھر سے بولیں گے ان کے لب کچھ تو!

میں نہیں مانگتا یہ سب دنیا
میرے معبود، میرے رب، کچھ تو

دیکھئے تو قصور اپنا بھی
ہم نے مانا نہیں تھا سب، کچھ تو

زندگی حادثہ نہیں امجدؔ
اس تماشے کا ہے سبب کچھ تو!

غزل

بزمِ جاناں میں کہیں اور وہ کب دیکھتے تھے!
جس طرف اُن کی نظر ہو وہیں سب دیکھتے تھے

کیسے خوش بخت تھے وہ لوگ کہ جو پیشِ کلام
بارہا سوچتے تھے، حدِّ ادب دیکھتے تھے!

پھر ہُوا یوں کہ کوئی دیکھنے والا نہ رہا
وہ کوئی کھیل نہیں تھا جسے سب دیکھتے تھے

مشغلہ جِن کا ہوا خلقِ خدا کی تکفیر
اپنے دامن کی سیاہی کو وہ کب دیکھتے تھے!

دیکھتے دیکھتے برباد ہوئے شہر کے شہر
ظلم کو، جن کے مکیں، مُہر بہ لب دیکھتے تھے

حُسن اس شخص پہ اُترا تو کوئی حد نہ رہی
آنکھ جو پُھول کھلاتی تھی تو لب دیکھتے تھے!

کیا ہے باہر، نہ کبھی اہلِ نظر نے دیکھا
کوئی اندر سے بلاتا تھا تو تب دیکھتے تھے

جن کی خوشبو سے دَر و بام ہیں روشن اب تک
دن کو دن جانتے وہ لوگ نہ شب دیکھتے تھے

یار کے حکم کی تعمیل تھی دنیا اپنی
کوئی مقصد کبھی پوچھا نہ سبب دیکھتے تھے

اُس کے آتے ہی بدل جاتی تھی دنیا امجدؔ
اور ہوتا تھا کوئی آئنہ، جب دیکھتے تھے

فیصلے کا لمحہ

دستکوں، صداؤں سے
دَر اگر نہ کُھلتا ہو
یار کی حویلی کا
اور یہ پتہ بھی ہو
ہر صدا وہ سنتا ہے، ہر خبر وہ رکھتا ہے
دیکھتا ہے روزن سے
وہ مِرا بکھرنا بھی!

واپسی کی وحشت کے
بے بسی کی سنگت کے

اُس زوال لمحے میں
کم نہیں قیامت سے
سیڑھیاں اترنا بھی!
ہر قدم پہ کانوں میں، اک صدا سی آتی ہے
''لاکھ بار اچھا ہے
اِس طرح کے جینے سے
اِس گھڑی تو مرنا بھی!''

کیا عجب تماشا ہے!
آس ختم ہونے پر
انتظار کرنا بھی!

غزل

لوگ میری بستی کے، کیا کمال کرتے ہیں
عکس مانگتے ہیں اور آئنوں سے ڈرتے ہیں

جاتے جاتے جائے گی، عمر بھر کی عادت ہے
آس کے بِنا جو ہم انتظار کرتے ہیں

شاعری کے موسم میں شعر قلبِ شاعر پر
ہجرتی پرندوں سے، دم بدم اُترتے ہیں

یاد چُھو بھی جائے تو خون رِسنے لگتا ہے
زخمِ آشنائی بس دیکھنے سے بھرتے ہیں

جانتے بھی ہیں کوئی معجزہ نہیں ہو گا
پھر بھی ہم منڈیروں پر دِل چراغ دھرتے ہیں!

صبح کے اجالے سے رات کی سیاہی تک
بار بار جیتے ہیں، بار بار مرتے ہیں

اس قمار خانے کے کیا عجب جواری ہیں
کھیل ختم ہونے پر جیتتے نہ ہرتے ہیں

ہم نے بھی کچھ ایسے ہی زندگی گزاری ہے
جس طرح سے خاکوں میں طفل رنگ بھرتے ہیں

روز و شب ہمارے ہیں پھول اُلجھے ہاروں کے
اک طرف سمٹتے ہیں، اک طرف بِکھرتے ہیں

غزل

ڈُوریاں سمٹنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے
رنجشوں کے مٹنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

ہجر کے دوراہے پر ایک پل نہ ٹھہرا وہ
راستے بدلنے میں، دیر کچھ تو لگتی ہے!

آنکھ سے نہ ہٹنا تم، آنکھ کے جھپکنے تک
آنکھ کے جھپکنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

حادثہ بھی ہونے میں وقت کچھ تو لیتا ہے
بخت کے بگڑنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

خشک بھی نہ ہو پائی روشنائی حرفوں کی
جانِ من مُکرنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے!

فرد کی نہیں ہے یہ، بات ہے قبیلے کی
گِر کے پھر سنبھلنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

درد کی کہانی کو، عشق کے فسانے کو
داستان بننے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

دستکیں بھی دینے پر، دَر اگر نہ کُھلتا ہو
سیڑھیاں اُترنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

خواہشیں پرندوں سے، لاکھ ملتی جلتی ہوں
دوست پَر نکلنے میں، دیر کچھ تو لگتی ہے

عمر بھر کی مہلت تو وقت ہے تعارف کا
زندگی سمجھنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

رنگ یوں تو ہوتے ہیں بادلوں کے اندر ہی
پر دھنک کے بننے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

اِن کی اور پھولوں کی ایک سی ردائیں ہیں
تتلیاں پکڑنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

زلزلے کی صورت میں عشق وار کرتا ہے
سوچنے سمجھنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے!

بِھیڑ وقت لیتی ہے رہنما پرکھنے میں
کاروان بننے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

ہو چمن کے پھولوں کا یا کسی پری وش کا
حُسن کو سنورنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

مستقل نہیں امجدؔ یہ دُھواں مقدّر کا
لکڑیاں سلگنے میں دیر کچھ تو لگتی ہے

اِس پَل

پھر کسی یاد نے کروٹ بدلی
آرزوؤں کے صنم خانے میں
سو چکی رات کے ویرانے میں
پھر کسی خواب کا سایہ جاگا

یوں کھلی چپکے سے خوشبو کسی سرگوشی کی
جیسے پت جھڑ میں یونہی کوئی کلی کِھل جائے
جیسے اک موڑ کے مڑتے ہی اچانک، یک دم
کوئی بھولی ہوئی سپنوں کی گلی مل جائے!

گم شدہ لمحے چمک اُٹھیں ستاروں کی طرح
پھر نِکل آئے کوئی چاند پرانا، جیسے

بے طلب جیسے سمندر کی کسی تہہ سے ملے
کسی ڈوبی ہوئی کشتی کا خزانہ، جیسے
خود بخود جا کے پلٹ آئے، زمانہ جیسے

درد میں ڈوبی ہوئی رات کے سنّاٹے میں
یک بیک پھر سے کسی آس کی قندیل جلی
دبے قدموں سے چلی
صحنِ احساس میں بھولی ہوئی آواز کوئی
روشنی ہونے لگی غم کی گزرگاہوں میں
در ہُوا باز کوئی!

دھیان میں اُگنے لگے پھر کسی خواہش کے کنول
دل کی دھڑکن کا اشارا ہے کہ تم آتے ہو
آپ سے آپ سمٹنے لگے بِکھرے ہوئے پَل
دُور سے کوئی پکارا ہے کہ تم آتے ہو
پھیلتی جاتی ہے سارے میں توجہ کی دھنک
اوج پر اپنا ستارا ہے کہ تم آتے ہو
روشنی ایسی ہے رستوں میں کہ دیکھی نہ سنی
موج میں چشمِ نظارا ہے کہ تم آتے ہو
کل رہے یا نہ رہے وقت ہمارے بس میں
ہاں مگر آج ہمارا ہے کہ تم آتے ہو۔

بہروپیئے

یہ لوگ کون لوگ ہیں!
یہ کس طرح کے لوگ ہیں!
یہ چلتی پھرتی پُتلیاں
ہے اِن کا کون سا جہاں!
کہاں ہیں اِن کے رابطے
کدھر ہیں اِن کی ڈوریاں!

بنے ہیں اپنے ناخدا
نہیں جنہیں گریز کرتے پانیوں کی کچھ خبر
نہ ساحلوں سے آشنا
نہ اِن کو ہے پتہ کوئی نہ ان کو کچھ شعور ہے
کہ ان کی کھوپڑی میں بس غرور ہی غرور ہے

نگاہ ان کی دس قدم سے دُور دیکھتی نہیں
دماغ میں فساد ہے
بس اپنے ہی مفاد کا
کہ اپنی ذات سے وراء تو ان کی سوچ ہی نہیں
یہ اپنے کام کے سوا، نہیں کسی بھی کام کے
ہر اک ہنر سے بہرہ ور، بس ان کے خاندان ہیں
کہ ان کے بیٹے بیٹیاں ہی حاصلِ جہان ہیں

سَمے کا اب ہے فیصلہ
جو ہو چکا سو ہو چکا
بچیں گے اب تو صرف وہ
کہ جن کے صبح شام میں
رہے گی سب سے معتبر بُجھے دِیوں کی روشنی
کٹے گی جن کی زندگی دلوں کے احترام میں
عوام کے لئے ہی جو
عوام کی طرح سے جو
جئیں گے اب عوام میں۔

غزل

تمہارا ہاتھ جب میرے لرزتے ہاتھ سے چُھوٹا، خزاں کے آخری دن تھے
وہ محکم بے لچک وعدہ، کھلونے کی طرح ٹُوٹا، خزاں کے آخری دن تھے

بہار آئی نہ تھی لیکن ہواؤں میں نئے موسم کی خوشبو رقص کرتی تھی
اچانک جب کہا تم نے، مِرے منہ پر مجھے جھُوٹا، خزاں کے آخری دن تھے

وہ کیا دن تھے! یہیں ہم نے، بہاروں کی دُعا کی تھی! کسی نے بھی نہیں سوچا
چمن والوں نے مل کر جب خود اپنا ہی چمن لُوٹا، خزاں کے آخری دن تھے

لکھا تھا ایک تختی پر ''کوئی بھی پُھول مت توڑے'' مگر آندھی تو اَن پڑھ تھی
سو جب وہ باغ سے گزری کوئی اُکھڑا، کوئی ٹُوٹا، خزاں کے آخری دن تھے

بہت ہی زور سے پیٹے، ہَوا کے بَین پر سینے، ہمارے خیر خواہوں نے
کہ چاندی کے وَرق جیسا، سمے نے جب ہمیں کُوٹا، خزاں کے آخری دن تھے

نہ رُت تھی آندھیوں کی یہ، نہ موسم تھا ہواؤں کا، تو پھر یہ کیا ہوا امجدؔ
ہر اک کونپل ہوئی زخمی، ہُوا مجروح ہر بُوٹا، خزاں کے آخری دن تھے

33 ماہیے

خوشبو سے بھری راتیں
تم ایک نظر دیکھو
پتھر بھی کریں باتیں

درویش جو ہوتے ہیں
چوروں کے نگر میں بھی
دَر کھول کے سوتے ہیں

دن رات کی گردش میں
کچھ بھی تو نہیں قائم
ہر چیز ہے لرزش میں

میں جھوٹ نہیں کہتا
اُس شخص کو دیکھے تو
دریا بھی نہیں بہتا

تدبیر نہیں بنتی
رنگ ایک بھی کم ہو تو
تصویر نہیں بنتی

ہے کون جو پورا ہے!
دنیا جسے کہتے ہیں
اک خواب ادھورا ہے

کیا بخت نکھرتا ہے
جس دم کسی شاعر پر
اک شعر اُترتا ہے

ہر چیز سنور جائے
آواز پرندوں کی
جب کان میں پڑ جائے

خوش باش رہو تم بھی
وہ بات جو دل میں ہے
اک بار کہو تم بھی

کیوں خواب دکھاتا ہے!
جو بیت گیا لمحہ
کب لوٹ کے آتا ہے

قسمت نہ چلی جائے
اس نیند کے کُھلنے تک
مہلت نہ چلی جائے!

ہر صبح یہ کہتی ہے
عزّت کے لیے سوچو
شہرت نہیں رہتی ہے

پَل چین نہیں لیتا
تری بزم سے اُٹھ آئیں
دل ساتھ نہیں دیتا

مہتاب نہیں کوئی
سپنوں کی دوکانوں میں
اب خواب نہیں کوئی

بے تاب چلے آئے
مٹی میں ملانے کو
احباب چلے آئے

دم ساز نہیں کوئی
تنہائی کے صحرا میں
آواز نہیں کوئی!

مجبور نہیں رہنا
آمد ہے بہاروں کی
اب دور نہیں رہنا

تنہائی میں رَو لیں گے
پہنائی ہے جو تم نے
زنجیر نہ کھولیں گے

کیوں پُھول نہیں کِھلتے
وہ مِل بھی اگر جائے
الفاظ نہیں مِلتے

مت پوچھ بہانے سے
ہم عشق کے ماروں کو
کیا کام زمانے سے

محبوب جو ربّ کا ہے
ہر چیز یہ کہتی ہے
محبوب وہ سب کا ہے

غم خوار نہیں کوئی
اس ہجر کے صحرا میں
دیوار نہیں کوئی

خوشبو کا اشارا ہے
اے مہکے ہوئے لمحے
کیا نام تمہارا ہے!

یہ بات حقیقت ہے
جس جھوٹ میں ہو سچ بھی
وہ جھوٹ قیامت ہے!

اللہ کی رحمت ہے
بچوں کی ہنسی، گھر میں
اک خاص عنایت ہے

خوش بخت وہ بندہ ہے
ہر عمر میں اک بچہ
جس شخص میں زندہ ہے

ہر بات فسانہ ہے
اس زیست کا واحد سچ
بچپن کا زمانہ ہے

رحمت کے فرشتے ہیں
ان جیسا نہیں کچھ بھی
جو پیار کے رشتے ہیں

بے نام ہوئے آخر
قسطوں میں جو زندہ تھے
نیلام ہوئے آخر

دریا کا کِنارا دے
ہے تلخ بہت جینا
اے خواب، سہارا دے

باغوں میں کِھلی کلیاں
اک شخص کی آہٹ سے
آباد ہوئیں گلیاں

ہے یاد زمانہ وہ
کیا اُس سے گِلہ کرتے
تھا دوست پرانا وہ

اک خاک کی ڈھیری ہے
مٹی کا بھروسہ کیا
تیری ہے نہ میری ہے۔

سہ پہر کی دھوپ

عاجزی کا چلن ضروری ہے
کیونکہ مٹی کا روپ ہیں ہم لوگ
نیکیاں سیکھئے ستاروں سے
روشنی جن کی استعارہ ہے
اپنے ہونے کا اور نہ ہونے کا
اور پھر ان کو بانٹتے جائیں
کام بس اس قدر ہمارا ہے

ہاں مگر کام ہے یہ عجلت کا
کچھ بھروسہ نہیں کہ کب چل دے
کاروبار، زندگی کی مہلت کا
وقت کے اس نگارخانے میں
ایک لمحے کا روپ ہیں ہم لوگ
سہ پہر کی سی دھوپ ہیں ہم لوگ!

دوہے

پیچھے ہٹتی منزل ہم کو ہر پَل یہ سمجھائے
دو رستوں پر چلنے والا کبھی نہ رستہ پائے

کچھ ہے گلابی کچھ ہے سنہرا اُس گوری کا رُوپ
شام میں جیسے گُھلتی جائے پچھلے پہر کی دھوپ

عکس اُسی کا بن جاتا ہے، اُس کا جو ہو جائے
ریت میں جیسے ریت ملے تو ہر رستہ کھو جائے

ایسے اُس کی یادیں دل پر گھیرا کرتی جائیں
شہر کی سڑکیں جیسے مِلتی اور بچھڑتی جائیں

دل ہی دل میں نئی کویتا یوں شاعر دہرائے
سب سے چُھپ کر جیسے سجنی خود کو دیکھے جائے

ایسے اُس کے رُوپ کا جادو باتیں کرتا تھا
دیکھ کے اُس کو ششدر چندا، چلنا بھول گیا

بچوں یا بوڑھوں سے ملنا دَونوں ایک سمان
کچھ نہ ان کی بات کا مطلب، سمجھیں بُدّھی مان

نکل سکے نہ اس الجھن سے بڑے بڑے استاد
بچوں سے بھی پیاری لاگے کیوں ان کی اولاد!

تاروں جیسی آنکھیں ان کی پُھولوں جیسے ہاتھ
جنّت چھوٹی پڑ جاتی ہے بچے ہوں جب ساتھ

غزل

کان لگا کر سُنتی راتیں، باتیں کرتے دن
کہاں گئیں وہ اچھی راتیں، باتیں کرتے دن

ایک ہی منظر، شہر پہ اپنے کب سے ٹھہرا ہے
کچھ سوئی کچھ جاگی راتیں، باتیں کرتے دن

دیوانوں کے خواب کی صُورت اَن مِل اور بے جوڑ
اپنے آپ سے لڑتی راتیں، باتیں کرتے دن

جانے کب یہ میل کریں گے ایک دوجے کے ساتھ
خاموشی میں ڈوبی راتیں، باتیں کرتے دن

تنہائی کے خوف کی دیکھو کیا کیا شکلیں ہیں
سناٹے میں لپٹی راتیں، باتیں کرتے دن

امجدؔ اپنے ساتھ رہیں گے کب تک رستوں میں!
گہری سوچ میں اُلجھی راتیں، باتیں کرتے دن

امجد اسلام امجد

ریشم ریشم (سفرنامہ)
یہ افسانے
اپنے لوگ
وقت
وارث
آنکھوں میں ترے سپنے
سپنے بات نہیں کرتے
عکس
سپنے کیسے بات کریں
تیسرے پہر کی دھوپ (کالم)
خواب جاگتے ہیں (ڈرامے)
سپنوں سے بھری آنکھیں (کلیات گیت)
یانصیب کلینک
دھند کے اُس پار
کوئی دن اور (کالم)

اَسباب (حمد، نعت، سلام)
بارِش کی آواز (شاعری)
شام سرائے (شاعری)
اِتنے خواب کہاں رکھوں گا (شاعری)
نزدیک (شاعری)
یہیں کہیں (شاعری)
ساتواں دَر (شاعری)
فشار (شاعری)
سحر آثار (شاعری)
ساحلوں کی ہوا (شاعری)
محبت ایسا دریا ہے (شاعری)
برزخ (شاعری)
اُس پار (شاعری)
پھر یوں ہوا (شاعری)
ذرا پھر سے کہنا (شاعری)

Rs. 400.00

www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-2783-6
ISBN-13 978-969-35-2783-4